بچوں کے لیے دلچسپ، انوکھی، سبق آموز اور منفرد کہانیاں
9
New
Stories
بہترین کہانیاں
پاک سپاہی
STORY NO
7
ماسٹر پبلشرز
المعراج سنٹر
22۔ اُردو بازار لاہور

جِنوں کا مکان

ہم سات دن سے مارے مارے پھر رہے تھے۔ مسئلہ تھا کرائے کے
تلاش کا۔ شاید آپ نے بھی کبھی کرائے کے مکان کی تلاش میں شہر کی
چھانی ہوگی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے۔ تو دوستو سات
ہم نے خوب مکان تلاش کیا۔ یہاں تک کہ انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ اور ایک
ہم بے دم ہو کر گرنے لگے۔ خیال آیا' کہیں بے ہوش نہ ہو جائیں۔ اگر
کھڑے یا چلتے چلتے بے ہوش ہونے کی حالت طاری ہو جائے تو فوراً بیٹھ
چاہیے۔ نہ جانے ہمیں یہ بات کس مہربان نے بتائی تھی۔ خیر' عین وقت پر یاد
ہم فوراً ایک مکان کے دروازے پر بیٹھ گئے اور گہرے گہرے سانس لینے

''یار راشد' معلوم ہوتا ہے' ہمیں مکان نہیں ملے گا۔'' میں نے ہانپتے
کہا۔ ''تو پھر ہم رہیں گے کہاں؟'' راشد بولا۔

''اس سوال سے زیادہ خوفناک سوال یہ ہے کہ ہم ابا جان کو کیا جواب
گے۔ چھ دن سے انہیں بھی کہہ رہے ہیں کہ بس کل ہم ضرور مکان ڈھونڈ لیں
'' میں نے کہا۔

''اب اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے بس کی بات تو ہے نہیں۔''
نے مایوس ہو کر کہا۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مکان کا دروازہ کھلا۔ ہم چونک اُٹھے۔ یہ تو ہم
ہی گئے تھے کہ اس وقت کسی کے دروازے پر بیٹھے تھے۔ مڑ کر دیکھا تو ایک

بوڑھا سا آدمی باہر نکل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی تھی' جس میں آدھے با
سفید اور آدھے کالے تھے۔ چہرے پر بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ یوں لگتا تھ
جیسے وہ بوڑھا بھی ہے اور جوان بھی' کیونکہ سفید بالوں کے ہوتے ہوئے اسکے
چہرے' ہاتھوں' جسم کے دوسرے حصّوں پر جھرّیاں ہونی چاہئے تھیں' لیکن شاید
ان صاحب نے اپنے بال دھوپ میں سفید کئے تھے۔ اس نے ہمیں پہلے تو گھورا پھ
مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگا:

''کیا بات ہے بچّو' تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''اگر آپ کو اعتراض ہے تو ہم اُٹھ جاتے ہیں۔'' میں نے باادب ہو کر کہا۔

''نہیں نہیں' تم بڑے شوق سے یہاں بیٹھو' بلکہ چاہو تو اندر چل کر بیٹھو۔ میں نے تو اس لئے پوچھا تھا کہ کہیں تم دونوں کسی پریشانی میں تو مبتلا نہیں ہو۔''

''جی' جی نہیں۔ ہم تو یونہی سانس لینے کے لئے بیٹھے تھے۔''

''بہت اچھا کیا' مگر تم دونوں تو بالکل نوعمر ہو' اس عمر میں بھی بھلا کوئی سانس لینے کے لئے بیٹھا کرتا ہے۔'' اس نے حیران ہو کر کہا۔

''جی' دراصل ہم صبح سے چل رہے ہیں۔ ایک منٹ کیلئے بھی بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔''

''آخر صبح سے مارے مارے کیوں پھر رہے ہو۔ کچھ تو بتاؤ۔'' بوڑھے نے پوچھا۔

''کیا بتائیں' ہمارے دُکھ کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ کوئی ہماری مدد نہیں کرتا۔'' میں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''مجھے بتاؤ' شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔'' اس نے کہا۔

''آپ' بھلا کیا کرسکیں گے۔'' راشد کے مُنہ سے نکلا۔

''جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ مسئلہ کیا ہے' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''دراصل' ہمیں ایک مکان کی تلاش ہے۔'' راشد نے کہا۔

''کیا کہا۔ مکان کی تلاش ہے؟''

''جی ہاں' کرائے کے مکان کی۔ خریدنے کا ارادہ نہیں ہے۔''

''اوہ' آؤ آؤ۔ اندر آؤ۔ میں تمہارا مسئلہ چٹکی بجاتے ہی حل کرسکتا ہوں۔''

بوڑھے نے خوشی سے کپکپاتے ہوئے کہا۔

ہم نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔ بھلا اس میں اس حد تک خوش ہونے کی کیا ضرورت کہ کپکپانے ہی لگے۔

''بات کیا ہے جناب! آپ ہمیں اندر کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔''

''اندر آجاؤ' تمہیں کرائے کا مکان چاہئے نا۔''

''جی ہاں۔'' راشد نے جلدی سے کہا۔

''بس تو پھر یوں سمجھو' تمہارا کام بن گیا۔''

ہم حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ ہمارا کام کیسے بن گیا۔ کیا یہ بوڑھا مکان کرائے پر دیتا ہے یا کمیشن ایجنٹ ہے جو کہہ رہا ہے کہ کام بن گیا۔ آخر ہم اس کے ساتھ مکان میں گھس گئے۔ اس نے اندر داخل ہونے کے بعد کہا:

''دیکھو اس مکان کو غور سے دیکھو۔ یہ تمہیں کیسا لگتا ہے۔''

''اچھا بھلا ہے' کیوں۔ آپ نے یہ کیوں پوچھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ۔ یہ مکان میرا ہے۔ کرائے کیلئے خالی ہے' ہاں بالکل خالی۔'' اس

نے خوشی سے چلا کر کہا۔ ’’کیا کہا‘ کرائے کے لئے خالی ہے۔‘‘ ہم دونوں ایک ساتھ چیخے۔

ہماری حیرت کا کیا پوچھنا۔ یہاں تو ہم سات دن سے سارے شہر کی خاک چھان رہے تھے اور دُور دُور تک کسی کرائے کے مکان کا نام و نشان تک نظر نہیں آیا تھا یا بیٹھے بٹھائے کرائے کا مکان مل رہا تھا۔‘‘ بڑے میاں کہیں آپ ہم سے مذاق تو نہیں کر رہے۔‘‘ ’’مذاق‘ بھلا میں اس عمر میں مذاق کروں گا‘ وہ تم بچوں سے۔‘‘

’’تو یہ مکان سچ مچ کرائے کیلئے خالی ہے؟‘‘ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

’’یہی تو کہہ رہا ہوں۔‘‘ بوڑھے نے پُر زور لہجے میں کہا۔ ’’کتنا کرایہ ہے اس کا؟‘‘

’’بیٹا جو تمہارا دل چاہے دے دینا۔ کیا تم دونوں رہو گے؟‘‘

’’جی نہیں‘ ہمارے ابّو‘ امی اور باجی بھی رہیں گے۔‘‘ ارشد نے کہا۔

’’ٹھیک ہے جو تم لوگوں کا دل کرے دے دینا۔‘‘ ہم نے ایسا مالک مکان آج تک نہیں دیکھا تھا۔ آج کے دَور میں جب مکان ڈھونڈنے سے نہیں ملتے اور مالک مکان مُنہ مانگے کرائے وصول کرتے ہیں بلکہ سال بھر کا کرایہ پیشگی وصول کر لیتے ہیں یہ بوڑھا ہم سے کہہ رہا تھا کہ جو جی چاہے دے دینا۔ ہماری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آخر میں نے کہا۔ ’’اچھا ٹھیک ہے‘ ہم اپنے گھر والوں کو لے آتے ہیں۔‘‘ ’’یہ چابی لے جاؤ‘ میں نہ ہوں تو بھی تم لوگ دروازہ کھول کر اپنا سامان رکھ لینا بس اُوپر والا ایک کمرہ خالی رہنے دینا۔ کیونکہ اس میں میری کچھ چیزیں رکھی ہیں۔‘‘

’’کوئی حرج نہیں‘ ویسے آپ خود کہاں رہتے ہیں؟‘‘ ’’میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایک جھونپڑی میں رہتا ہوں۔‘‘ ’’آپ یہاں کیوں نہیں رہتے؟‘‘ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

’’اگر یہاں رہوں تو ہم کھائیں کہاں سے۔ اس مکان کے کرائے پر ہماری گزر بسر ہوتی ہے۔ بدقسمتی یہ کہ کوئی کرائے دار یہاں ٹکتا نہیں۔‘‘ سوچے سمجھے بغیر بوڑھے کے مُنہ سے نکل گیا۔ ’’کیا مطلب؟ ہم دونوں چونکے۔ ’’کک کچھ نہیں۔‘‘ وہ ہکلایا۔ ’’بڑے میاں‘ آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔ صاف صاف بتایئے بات کیا ہے؟‘‘ میں نے فکر مند ہو کر کہا۔

’’ہاں‘ مجھے نہیں چھپانا چاہئے۔ یہ بے ایمانی ہے‘ میں بے ایمانی نہیں کروں گا۔ سُنو بیٹو‘ لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اس مکان میں جن بھوت رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا‘ لوگوں کا یہ خیال کس حد تک درست ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو بھی کرائے دار آ کر ٹھہرتا ہے‘ بھاگ جاتا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے مکان کرائے پر لیں یا نہ لیں۔‘‘ ’’نہیں بابا‘ ہم جنوں اور بھوتوں سے نہیں ڈرتے‘ آپ فکر نہ کریں۔ ہم آج ہی اپنا سامان اٹھا کر یہاں آ جائیں گے۔ لیکن آپ کرایہ تو بتا دیں۔‘‘ ’’میں نے کہا نا‘ جو دل کرے دے دینا۔‘‘ ’’نہیں بابا‘ آپکو بتانا ہوگا۔‘‘ ’’اچھا تو تین ہزار روپے دے دینا۔‘‘ ’’اس مکان کے صرف تین ہزار روپے مہینہ۔‘‘ اور ہم حیران رہ گئے۔ اس دَور میں جبکہ چھ ہزار روپے ماہوار کرائے پر مکان ملنا بھی مشکل تھا ہمیں تین ہزار روپے کرائے کا مکان مل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’مگر بابا‘ یہ تو بہت کم ہے‘ ہم آپ کو پانچ ہزار رُوپے دے دیں گے۔‘‘ ’’نہیں بیٹا‘ تین ہزار رُوپے میں ہمارا گزارہ ہو جاتا ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اچھا خیر ہم پھر دیکھیں گے۔‘‘ یہ کہہ کر ہم اس سے رخصت ہوئے اور اپنے مکان میں پہنچے

جسے خالی کرنے کیلئے مالک مکان نے الٹی میٹم دے رکھا تھا۔ہم نے جاتے ہی ابّو سے کہا۔''ابّو مکان مِل گیا ہے۔''

''کیا کہا مکان مِل گیا۔مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''انھوں نے چلّا کر کہا۔'' ہونے کو اس دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا۔''راشد نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔مگر کتنے کرائے کا ملا ہے۔ضرور آٹھ دس ہزار رُوپے کا مکان دیکھ کرآئے ہوگے۔حالانکہ میں نے پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار رُوپے کرائے کا مکان ہم لے سکتے ہیں۔''

''آپ غلط سمجھے ابّو' مکان کا کرایہ کم سے کم تین ہزار رُوپے اور زیادہ سے زیادہ چار ہزار رُوپے دینا ہوگا۔''''کیا کہا' تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔''انہوں نے ہم دونوں کو گھورا۔''ہم سچ کہتے ہیں ابّو''۔مَیں نے کہا اور انہیں ساری بات بتادی۔ساری بات سُن کر ابّو بولے۔ ''اوہ' ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ہمیں جنوں بھوتوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے چلو اُٹھاؤ سامان۔''اور ہم اس مکان میں آگئے۔اچھا بھلا مکان تھا۔تھا بھی صاف سُتھرا۔شاید بوڑھا اس کی روزانہ صفائی کرتا رہا تھا۔''ابّا جان' کچھ جنوں اور بھوتوں کے متعلق بھی سوچا ہے۔''راشد نے کہا۔''سب لوگ آیۃ الکرسی پڑھ کر اپنے اُوپر دَم کریں اور مکان کی دیواروں پر بھی پھونکیں ماریں۔''امّی نے ہدایت فرمائی۔ہم نے ایسا ہی کیا لیکن راشد کو آیۃ الکرسی یاد نہیں تھی اس کی طرف سے میں نے پڑھی اور اس پر دَم کیا۔آخر ہم سونے کیلئے لیٹ گئے۔جب دُوسرے دِن ہم جاگے تو ہماری چارپائیاں اُلٹی پڑی تھیں اور ہم اُلٹی چارپائیوں کے اُوپر بے خبر سو رہے تھے ہم حیران رہ گئے۔جنوں بھوتوں نے ہماری چارپائیاں اُلٹنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا تھا اور ہمیں تو معلوم بھی نہیں ہوا تھا' چارپائیاں کب اُلٹی گئیں۔بڑے شریف جن

بھوت تھے۔ابّو اور امّی کا خیال تھا کہ یہ برکت آیۃ الکرسی کی تھی' ورنہ ہم بھی اُلٹے ہوتے۔دُوسرے دن بھی ہم نے آیۃ الکرسی کا وِرد کیا اور سونے کیلئے لیٹ گئے۔ اگلے دِن پھر چارپائیاں اُلٹی تھیں۔اچانک راشد نے کہا:''ہم ان جنوں اور بھوتوں کو کیوں تکلیف دیں۔''''کیا مطلب؟''ابو چونکے۔وہ اتنا ہی تو کرتے ہیں نا کہ ہماری چارپائیاں اُلٹ دیتے ہیں تو کیوں نہ ہم خود ہی اُلٹی چارپائیوں پر سو جایا کریں اس طرح انہیں بے آرام ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔''''بات تو معقول ہے۔آج ہم ایسا ہی کریں گے۔''اس روز سے ہم نے چارپائیاں اُلٹی بچھائیں اور سونے کیلئے لیٹ گئے۔دُوسرے روز ہم جاگے تو جُوں کے توں تھے اس کا مطلب تھا' اس رات جنوں اور بھوتوں نے واقعی کوئی تکلیف نہیں کی تھی اب تو ہم ہر روز یہی کرنے لگے۔اُلٹی چارپائیوں پر سو جاتے صبح تازہ دم ہو اٹھتے اور خدا کا شکر ادا کرتے' جس نے ہمیں اتنے کم کرائے کا مکان دِلا دیا تھا اُلٹی چارپائیوں پر سونے میں حرج ہی کیا تھا۔لوگ تو فرش پر سو کر گزارہ کرلیتے ہیں۔بوڑھا ہر ماہ آکر کرایہ وصول کرتا رہا۔ہم نے سو رُوپے طے کرلئے تھے بوڑھا اب بہت خوش تھا۔وہ ہمیں ہر روز ہزاروں دُعائیں دیتا اور ہم یہ محسوس کرتے کہ اس طرح تو ہمارے پاس دُعاؤں کا بہت بڑا اسٹاک جمع ہوجائے گا۔ کئی ماہ اسی طرح سوتے گزر گئے۔ایک دن راشد کو کچھ خیال آیا۔اس نے کہا:

''میرا خیال ہے' جن بھوت ہماری شرافت سے مجبور ہو کر یہاں سے چلے گئے ہیں' کیونکہ ہم نے ان کے آرام کا خیال رکھا ہے۔''

''تو پھر' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کیوں نہ ہم اب چارپائیاں سیدھی کرلیں۔''

ٹھیک ہے۔اس روز ہم سیدھی چارپائیوں پر سوئے۔دوسرے دِن اُٹھے تو چارپائیاں اُلٹی پڑی تھیں۔

☆☆☆

فیصلہ

سائرہ ایک پیاری سی بچی تھی۔یوں تو اس کی سب عادتیں اچھی تھیں لیکن وہ بہت لاپرواہ تھی۔ایک دن کیا ہوا کہ جب وہ سکول سے واپس آرہی تھی تو اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اسی طرح گھر جانے لگی۔راستے تو اس کے دیکھے بھالے تھے ہی لہٰذا مزے مزے سے آنکھیں بند کئے ہوئے تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ چلتی رہی۔یکا یک اُسے ٹھوکر لگی اور وہ پتھریلی فٹ پاتھ پر گر پڑی۔اب جو اس نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک سنہری بٹوا فٹ پاتھ کے کنارے پڑا ہوا ہے۔اُس نے بٹوے کو کھولا تو اس میں سے سرخ سرخ نوٹ جھانکنے لگے۔سائرہ نے جلدی جلدی نوٹ نکالے اور گنے تو وہ پورے ایک ہزار نکلے۔

اب تو سائرہ بہت پریشان ہوئی کہ پتہ نہیں کس کے پیسے ہیں؟ آخر کافی سوچنے کے بعد بھی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی امی سے معلوم کرنا چاہیے کہ اب کیا کیا جائے۔

اب تو سائرہ تیز تیز چلنے لگی تا کہ جلدی سے گھر جا کر اپنی امی سے مشورہ کر سکے۔چلتے چلتے جب وہ کھلونوں کی دکان کے پاس سے گزری تو اس کی رفتار خود بخود ہی کم پڑ گئی۔نجانے وہ کب سے اس خوبصورت اور پیاری سی نیلی آنکھوں والی گڑیا کو خریدنا چاہتی تھی جو کہ آنکھیں کھولتی اور بند کرتی تھی،لیکن اس کے دماغ نے

اُسے سمجھایا کہ وہ پیسے اس کے نہیں ہیں اور اُن پر اس کا کوئی حق نہیں۔لہٰذا اُس نے اپنی رفتار پھر تیز کی اور بس اسٹاپ کی جانب چلتی رہی۔آخر کار بس اسٹاپ بھی آ ہی گیا اور وہ بس میں بیٹھی اور اپنے گھر پہنچی۔وہاں کیا دیکھتی ہے کہ اس کے چچا جان انسپکٹر جاوید بھی آئے بیٹھے ہیں۔اب سائرہ نے جلدی سے چچا اور امی کو پورا قصہ سنایا۔

چچا جان نے پرس سائرہ سے لیا اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ پرس کی پلاسٹک پگھل رہی ہے لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پرس کئی دن سے دھوپ میں پڑا رہا ہے لیکن کیوں کہ کسی نے اتنے دن گزرنے کے بعد بھی اس کی رپورٹ نہیں کروائی اس لئے قانوناً اب یہ پیسے سائرہ کے ہیں۔

یہ سن کر تو سائرہ خوشی کے مارے اچھل ہی پڑی۔سب سے پہلا خیال اسے نیلی آنکھوں والی گڑیا کا ہی آیا۔اب کیا تھا اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ کھانا کھایا،کپڑے بدلے اور اپنی امی کو ساتھ لے کر کھلونوں کی دکان کی طرف چل پڑی۔

کافی انتظار کے بعد بس آئی۔اب تو سائرہ کو ایک ایک لمحہ بہت طویل محسوس ہو رہا تھا۔چند اسٹاپوں کے بعد بس میں ایک اندھا آدمی سوار ہوا۔بے چارے کے پاس چھڑی تک نہ تھی اور وہ لوگوں سے ٹکراتا ہوا اپنے ہاتھوں کو لہراتا ہوا سہارے کے لیے بس کا ڈنڈا ڈھونڈ رہا تھا۔دفعتاً بس ایک جھٹکے سے چلی اور اندھا گر پڑا اور پھر ایک مہربان آدمی نے اس کے لئے اپنی سیٹ خالی کر دی۔

سائرہ کو بے چارے اندھے پر بہت ترس آیا اور وہ سوچنے لگی کہ اندھوں کے لیے زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہے۔یہ کوئی بھی خوبصورت چیز دیکھ نہیں سکتے نہ معلوم اس اندھے جیسے اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو آنکھوں جیسی نعمت سے

محروم ہیں۔

یہ سوچتے ہی سائرہ نے ایک فیصلہ کیا اور اگلے اسٹاپ پر ایک مضبوط ارادے کے ساتھ اُتری اور سیدھی اندھوں کی مدد کے لیے کھولے جانے والے مرکز پر جا پہنچی اور وہ ایک ہزار روپیہ جس سے وہ اپنے لئے کھلونے خریدنا چاہتی تھی اندھوں کی خدمت کے لئے جمع کروا دیئے۔ یہ کرتے ہوئے سائرہ کو سچی خوشی محسوس ہوئی جو گڑیا خرید کر بھی نہیں مل سکتی تھی۔

سائرہ کی امی بھی سائرہ کی اس عقلمندی سے بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے سائرہ کو وہی گڑیا جس کی سائرہ کو خواہش تھی تحفہ کے طور پر خرید کر دے دی۔

دیکھا بچو! سائرہ کے دل میں کس طرح معذور انسانوں کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی آپ بھی ہمیشہ ایسے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کریں اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کیا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ سے ہمیشہ خوش رہے۔

☆☆☆

غداری کی سزا

ایک پہاڑی گاؤں میں گھوڑوں کا سوداگر رہا کرتا تھا۔ سوداگر کا نام رستم تھا۔ وہ جتنا چالاک اور فریبی تھا اتنا ہی ظالم بھی تھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ سیدھے سادے لوگوں کو چرب زبانی سے اپنے جال میں پھنسا کر اُنھیں لوٹ لیتا اور ان پر بالکل رحم نہ کرتا رستم نکمے اور بیمار گھوڑے اونے پونے داموں خرید کر لاتا اور چالاکی سے مہنگی قیمتوں فروخت کر دیتا۔ اور چھاتی ٹھونک کر کہتا۔ ''بس۔ بس خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا۔''

گاؤں کے سیدھے سادھے ایماندار لوگ رستم سے بہت پریشان تھے۔

لیکن وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ کیونکہ اس گاؤں میں گھوڑوں کا دُوسرا کوئی تاجر نہ تھا۔ اور یوں بھی رستم اوپر کے حاکموں سے بنا کر رکھتا تھا اس لئے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ ایک بوڑھا کسان گھوڑا خریدنے کے لئے رستم کے پاس گیا۔ وہ صورت سے ہی سیدھا سادھا آدمی لگتا تھا۔

رستم نے اسے تاڑ لیا اور دل میں یہ ٹھان لی کہ اسے بیوقوف بناؤں گا اور ٹھگ لوں گا۔

اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہیں گھوڑا چاہیے لیکن میرے پاس تمہارے لئے کوئی گھوڑا نہیں کیوں کہ تم ایک بوڑھے آدمی ہو اور تمہارے لئے کوئی بوڑھا جانور ہی مناسب ہوگا۔

کسان بولا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں مجھے ایک جوان اور تندرست گھوڑا چاہئے۔ میں اس کے مناسب دام دوں گا۔''

اب رستم نے اپنی لچھے دار گفتگو شروع کی۔ بولا ابے'' نوجوان گھوڑا تمہارے لیے درست نہیں ہے۔ اس پر تم سواری نہ کر سکو گے۔ وہ تمہیں راستے ہی میں لوٹا دے گا۔ تمہاری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی ٹھہرو میں تمہارے لئے ایک مناسب گھوڑا لا رہا ہوں۔''

کسان بولا۔

''اچھا تم پہلے گھوڑا تو دکھاؤ۔''

رستم نے کہا۔ ''تم بتاؤ کتنی رقم خرچ کرو گے؟''

کسان نے سادگی سے جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ دو سو روپے۔''

بس ٹھیک ہے رستم نے کہا۔ نکالو دو سو رُوپے اور گھوڑا میں ابھی لاتا ہوں۔"

کسان پہلے تو ہچکچایا' پھر پیسوں کی تھیلی نکال کر رستم کے حوالے کر دی۔

اس نے وہ رُوپے گن کر اپنی جیب میں ڈالے اس کی آنکھ میں چمک پیدا ہوگئی۔ کہا۔"ابھی ایک اعلےٰ نسل کا گھوڑا تمہارے لئے لاتا ہوں۔

"بڑا جوان اور شہ زور ہے۔ اب اگر تم اس پر سے گر کر زخمی ہو تو یاد رکھو' میری ذمہ داری نہ ہوگی۔"

لیکن رستم جو گھوڑا لے کر آیا وہ اتنا بوڑھا اور لاغر تھا کہ اسے چلنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ کسان اسے دیکھ کر چیخ پڑا۔ بولا۔ یہ کیا ہے میں یہ گھوڑا نہیں لوں گا۔ لاؤ میری رقم واپس کرو۔

میں ایک غریب آدمی ہوں مجھے کیوں لوٹ رہے ہو۔ رستم نے بوڑھے کی چیخ و پکار پر کوئی توجہ نہ دی۔ کہا۔" تم تو بے وقوف ہو۔ اسے لے لو یہ بہت اچھا ہے۔ دو سو روپوں میں اور کیا لو گے۔ تمہیں تو میرا اصول معلوم ہی ہوگا۔ یہاں خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوتا۔"

بوڑھا کسان اپنی نادانی پر آنسو بہاتا گھوڑے کی باگ ہاتھ میں پکڑے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ ذرا ہی دُور گیا تھا کہ گل خاں راستے میں مل گیا۔

گل خاں ایک بہادر اور رحمدل سردار تھا۔ بوڑھے کسان نے اسے اپنی درد بھری کہانی سنائی تو وہ بولا۔" تم آہستہ آہستہ چلو۔ میں ایک ترکیب چلاتا ہوں۔ اس طرح شاید تمہاری رقم مل جائے۔"

یہ کہہ کر وہ رستم کے ڈیرے پر پہنچا۔ جو اپنی کامیابی پر خوش بیٹھا' مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

علیک سلیک کے بعد گل خان نے کہا۔

"رستم مجھے ایک گھوڑا چاہیئے۔ جو بوڑھا ہو اور ذرا کمزور ہو۔ تم تو جانتے ہو۔ میرا باپ اب کسی اچھے تندرست اور جوان گھوڑے پر سواری کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ میں اس گھوڑے کے تمہیں چھ سو روپیہ تک دینے کو تیار ہوں۔"

شہباز خاں بولا۔"تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے اصطبل سے اپنا تیز رفتار گھوڑا نکالا خوشی سے اُسے سرپٹ دوڑاتا ہوا راستے میں بوڑھے کسان کو جا لیا۔

بوڑھے کو راستے میں روک کر رستم نے کہا تم اپنے پیسے واپس لے اور میرا گھوڑا واپس کر دو۔"

بوڑھے کسان نے کہا۔"یہ نہیں ہوسکتا۔"

"میں اپنی خریدی ہوئی چیز واپس نہیں کرتا۔"

رستم نے پہلے تو کسان کو آنکھیں دِکھائیں' پھر خوشامد کرنے لگا۔ آخر میں گڑگڑا کر بولا۔

"خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو چلو تم اپنا منافع لے لو۔ میں اس کے تین سو رُوپے دُوں گا۔ نہیں مانتے چلو ساڑھے تین سو روپے لے لو۔ ارے بھائی چار سو روپے ہی لے لو۔

میں اِس سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دے سکتا۔ دو سو کے چار سو مل رہے ہیں۔ بڑے میاں پاگل نہ ہو۔ یہ لو روپے اور لاؤ میرا گھوڑا۔

ذرا جلدی کرو۔

"شاباش"

لیکن کسان بھی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ جب رستم نے بہت زیادہ اصرار کیا تو

کسان نے کہا۔

''اچھا بھائی' یہی سہی۔''

اس نے گھوڑے کی باگ رستم کے ہاتھ میں دے دی۔

چار سو روپے گن کر جیب میں رکھے۔اور اپنے راستے پر چل پڑا۔

وہ بہت خوش تھا کہ اسے دوسو کے بدلے چار سو روپے مل گئے۔

اس کی سمجھ میں آئی کہ اس رقم میں تو کسی دوسری جگہ سے ایک کی بجائے دو عدد شاندار گھوڑے خریدے جاسکتے ہیں۔

ادھر رستم گھوڑے کو لے کر بہت خوش ہوا۔

دل میں سوچ رہا تھا چار سو کا گھوڑا چھ سو روپے میں بیچوں گا۔

بلکہ میں تو اس سے سات سو روپے مانگوں گا۔ساڑھے چھ سو تو دے ہی دے گا۔

یہی کچھ سوچتا ہوا وہ اپنے ڈیرے پر پہنچا۔وہاں پہنچ کر دیکھا کہ گل خان وہاں سے جا چکا تھا۔

رستم نے اپنا منہ پیٹ لیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس نے کہا۔

ہائے میں تو لٹ گیا۔

کئی روز بعد گل خان اور رستم کا آمنا سامنا ہوا۔

گل خان بولا۔

''تم نے مجھ سے دھوکا کیا۔میں راہ تکتا رہا اور تم واپس نہیں آئے۔

رستم بولا۔

لیکن میں تو تباہ ہو گیا۔

میرے پورے دو سو روپے لٹ گئے۔

گل خان نے کہا۔

کوئی بات نہیں۔

کاروبار میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے۔لیکن یاد رکھو!

آئندہ غریب اور بوڑھے لوگوں کو تنگ نہ کرنا۔ اللہ کمزوروں اور مظلوموں کا ساتھ دیتا ہے۔اس واقعہ کا رستم پر بہت اثر ہوا۔اور اس نے توبہ کی اور نیت کر لی آئندہ کسی کو نہیں ٹھگوں گا۔

☆☆☆

تین بیوقوف

ڈنکو 'بنکو اور چنکو تینوں بھائی اول درجے کے کاہل اور بیوقوف تھے۔

رات دن پڑے پڑے چار پائیاں توڑا کرتے۔ماں بے چاری انہیں بہت سمجھاتی کہ بیٹا' اس کاہلی کو چھوڑو اور محنت کرو' ورنہ بڑے ہو کر روٹیوں تک محتاج ہو جاؤ گے۔مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔

بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ماں نے انہیں گاؤں کے مدرسے میں داخل کر دیا' مگر ان تینوں کے لئے یہ بڑی پریشانی کی بات تھی کہ انہیں صبح سویرے اٹھنا پڑے گا۔

ڈنکو اور بنکو نے چنکو سے کہا:'' چنکو بولا! اسکول جس وقت لگتا ہے اس وقت تو ہم دونوں سو رہے ہوتے ہیں۔ہم اسکول کس طرح جائیں گے۔''

''ارے بھائی! مفت میں دماغ کیوں کھپاتے ہو۔صبح سویرے اماں اٹھا دیا کریں گی۔'' چنکو نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر بنکو اور ڈنکو کو کچھ اطمینان ہوا' مگر دوسرے دن جب ان کی
نے صبح سویرے اٹھایا تو انہیں اٹھتے اٹھتے کافی دیر ہوگئی اور وہ پہلے ہی دن ا
دیر سے پہنچے۔ ماسٹر صاحب نے دونوں کو اس کی سزا دی۔ اس دن کی سزا کا
اچھا اثر پڑا۔ انہوں نے طے کرلیا کہ اب وقت پر اسکول جایا کریں گے۔

ماں کو تاکید کر دی گئی کہ انہیں روزانہ سویرے وقت پر اٹھا
کریں۔ دوسرے دن صبح سویرے ماں نے تینوں کو جگایا: ''اٹھو بیٹا' دیکھو ال
درخت کے اوپر سورج کی کرنیں ناچ رہی ہیں۔ منہ ہاتھ دھوؤ ناشتہ کرو اور ا
جاؤ۔''

''ہاں' ہاں اٹھتے ہیں ماں' کون سی ایسی ریل چھوٹی جا رہی ہے۔''
انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

دوسری طرف سے چنکو کی آواز آئی: ''بھیا بنکو! ذرا اٹھانا مجھے ہاتھ پ
۔اس وقت تو اٹھنے کو جی بالکل نہیں چاہتا۔''

بنکو غرایا: ''واہ' تم خود کیوں نہیں اٹھتے؟ ارے خود اٹھو اور ذرا مجھے
سہارا دے کر اٹھاؤ۔''

دونوں ایک دوسرے سے خفا ہوگئے۔ آخر ماں نے ہی تینوں کو اٹھایا
منہ ہاتھ دھلا کر اسکول بھیجا۔ جب وہ اسکول پہنچے تو دیکھا کہ ماسٹر صاحب کلا
کے لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ ''ہمیں سستی اور کاہلی کو اپنے پاس بھی نہیں پھ
دینا چاہیے۔ آدمی کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہیں۔ د
بچو! اگر تم بڑے آدمی بننا چاہتے ہو تو ان سے چھٹکارا پاؤ۔ محنت اور جدوجہد س
بڑے سے بڑا کام بھی کر سکو گے۔ پھر تمہاری شہرت دنیا کے چاروں کونوں م
پھیل جائے گی۔''

یہ سن کر چنکو سے نہ رہا گیا۔ اس نے ماسٹر صاحب سے پوچھا: ''واہ ماسٹر
صاحب' واہ! اس دن تو آپ یہ پڑھا رہے تھے کہ دنیا گول ہے۔ بھلا یہ شہرت دنیا
کے چاروں کونوں میں کس طرح پھیلے گی؟ کہیں گول چیز کے بھلا کونے ہوتے
ہیں؟''

اس کے اس سوال پر پوری کلاس قہقہوں سے گونج اٹھی۔

ایک دن ماسٹر صاحب نے بنکو سے سوال کیا۔

''بتاؤ بنکو' اگر تمہارے پاس پندرہ روپے ہوں تمہیں پچیس پیسے والی
کاپیاں خریدنی ہوں تو تمہیں دوکاندار کتنی کاپیاں دے گا؟''

بنکو سر کھجاتے ہوئے کاہلی سے بولے۔

''ماسٹر صاحب! اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ اس رقم
میں جتنی کاپیاں آئیں گی۔ دوکاندار خود دے دے گا۔ آخر حساب کرنے سے کیا
فائدہ؟''

اسکول میں یہ تینوں بھائی بالکل پڑھتے لکھتے نہ تھے۔ ان کی کاہلی اور سستی
جوں کی توں رہی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر ان کی ماں کو پہلے ہی دن سے تھا۔ تینوں
امتحان میں فیل ہوگئے۔ اور اسکول سے ان کے نام کاٹ دیئے گئے۔ ماں ان کی
حالت دیکھ کر بہت پریشان تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ اگر ان کی یہی حالت رہی تو
آگے چل کر ان کا کیا ہوگا۔ مگر چنکو' بنکو اور ڈنکو پروا نہ کرتے اور مزے سے پڑے
پڑے آرام کیا کرتے۔

کچھ دن بعد انہیں کسی دوسرے گاؤں میں شادی پر جانا تھا۔ ان کی ماں کی
طبیعت خراب تھی اور وہ جا نہیں سکتی تھیں۔ اس نے ان تینوں کو سمجھایا کہ وہاں جا
کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے ان کی بدنامی ہو اور لوگ انہیں سست' کاہل

اور بے وقوف نہیں' انکو ماں کی یہ نصیحت بہت بری لگی۔ انہوں نے کہا: ''ا
آخر آپ ہمیں اس قدر احمق کیوں سمجھتی ہیں؟ ہم اپنا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں۔''

دوسرے گاؤں جانے کے لئے کوئی سواری نہ تھی۔ لہٰذا دونوں پیدل روانہ ہوئے۔ کچھ دور چل کر چنکو بولا ''بھیا بنکو! اب تو بہت تھک گئے ہیں۔ آ قدم بڑھایا نہیں جاتا۔ آؤ کچھ دیر آم کے پیڑ کے نیچے ستا لیں۔''

''خوب تم نے میرے منہ کی بات چھین لی' میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' ا سایہ دار آم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ پھر لیٹ گئے۔ ہوا کے ہلکے ٹھنڈے جھونکوں نے انہیں جلد ہی سلا دیا۔

دن ڈھلے انکی آنکھ کھلی۔ بھوک کے مارے ان کا برا حال تھا۔ قریب ایک پکا ہوا آم پڑا تھا۔ بنکو بولا ''چنکو بھیا! بھوک بہت زور کی لگی ہے۔ ذرا اس آ کو اٹھا کر میرے منہ میں نچوڑ دینا۔''

چنکو غصے میں آ کر بولا ''واہ' یہ خوب رہی! میرا حال تو تم سے بھی زیا خراب ہے۔ تم خود ہی ذرا اسے اٹھا کر میرے منہ میں نچوڑ دو نا!''

دونوں آپس میں لڑ جھگڑ کر خاموش ہو گئے۔ آم جوں کا توں وہیں پڑا رہا
اتفاق سے ایک راہ گیر ادھر سے گزر رہا تھا۔ چنکو زور سے چیخا: ''بھا صاحب! تھوڑا سا پانی اس چشمے سے لا دو' مجھے بڑی پیاس لگی ہے۔''

راہ گیر سمجھا شاید دونوں بیمار ہیں۔ اسے ان پر رحم آ گیا۔ وہ دوڑا دوڑا گ اور ان کے لئے پانی لے آیا۔ دونوں نے خوب پانی پیا۔

بنکو نے اس مسافر سے کہا: ''بھیا ذرا دو چار چھینٹوں سے ہمارا منہ بھی دھ دو۔'' راہ گیر نے ان کے منہ بھی دھلا دیے۔

اب چنکو اطمینان کا سانس لے کر بولا ''اے میرے بھائی! اصل بات

یہ ہے کہ ہماری ماں نے ہمیں نصیحت کی تھی کہ کوئی چیز منہ دھوئے بغیر نہ کھایا کرو۔ اب ایک اور کام کرو۔ اس آم کو ہمارے منہ میں نچوڑ دو۔''

راہ گیر ان کی باتوں سے سمجھ گیا کہ یہ تینوں پرلے درجے کے کاہل اور سست ہیں۔ اسے ان پر سخت غصہ آیا۔ اس نے آم اٹھایا اور خود چوستا ہوا چل پڑا۔ دونوں چیختے چلاتے رہ گئے۔

تھک ہار کر آخر کار یہ دونوں پھر اپنی منزل کی طرف بڑھے۔ بھوک کے مارے ان کا برا حال تھا۔ راستے میں انہیں ایک فقیر ملا۔ اس نے گڑگڑا کر ان سے بھیک مانگی۔ ڈنکو، بنکو اور چنکو کو فقیر پر رحم آ گیا۔ بنکو نے کہا: ''بھیا چنکو! ذرا میری جیب سے دس پیسے نکال کر بابا کو دے دو۔''

چنکو آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولا: ''واہ' بھئی' واہ! کاہلی کی بھی حد ہو گئی۔ کیا میں تمہارا نوکر ہوں؟ خود جیب سے پیسے نکال کر دو' اگر اپنی جیب سے پیسے نہ دینا چاہو تو میری جیب سے نکال کر دے دو۔''

تینوں اسی طرح آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ کہ فقیر نے اس مسئلے کا حل پیش کیا اور اس نے کہا۔ ''کیا میں خود دس دس پیسے آپ دونوں کی جیبوں سے نکال لوں؟''

''کیوں نہیں' کیوں نہیں' نیکی اور پوچھ پوچھ۔ پیسے نکال لو بابا' مگر دس دس پیسے ہی نکالنا۔ ہمیں ابھی کھانا بھی کھانا ہے۔'' دونوں خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ان کی ایک بڑی الجھن خود ہی دور ہو رہی تھی۔

کچھ دور چل کر سڑک کے کنارے انہیں ایک ہوٹل نظر آیا گرم گرم روٹی اور سالن کی مہک نے انہیں بے تاب کر دیا۔ دونوں لپکتے ہوئے ہوٹل میں پہنچے اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پیسے دیتے وقت دونوں کے پیروں تلے سے زمین نکل

گئی کیونکہ ان کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ فقیر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہو
سارے پیسے نکال کر لے گیا تھا۔ ہوٹل والے نے پیسے نہ ملنے پر تینوں کی خوب پٹ
کی اور ان کے کپڑے اتروالئے۔ دونوں چھوٹے چھوٹے جانگیے پہنے سڑک پر م
بسورے کھڑے تھے۔ بنکو بولا: ''بھیا چنکو اس حالت میں ہم شادی میں کیسے جا
ہیں۔ تمام لوگ ہنسیں گے۔ چلو گھر لوٹ چلیں۔''

تھکے تھکے اور بوجھل قدموں سے تینوں اپنے گھر کی طرف واپس لوٹے۔
چلتے چلتے چنکو نے کہا: ''بھیا بنکو اور ڈنکو اپنی سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے۔ ما
ٹھیک ہی کہتی ہے کہ ہماری یہ سستی اور کاہلی ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گی۔ دیکھو کاہلی
اور سستی کی وجہ سے ہی آج ہماری یہ درگت ہوئی ہے۔''

بنکو بولا: ''بھیا! سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں' آج کا یہ سبق ہمارے لئے
کافی ہے۔ آؤ' سچے دل سے اب عہد کریں کہ سستی اور کاہلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
چھوڑ دیں گے۔ خوب محنت سے اپنا کام کریں گے اور پڑھیں لکھیں گے۔''

ڈنکو بولا: ''بھائی میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی بھی سستی اور کاہلی سے کام
نہیں لوں گا۔ اب میری توبہ۔۔۔۔۔''

تینوں اپنے فیصلے پر مسکرا اٹھے۔ چستی اور پھرتیلے پن کی کرنیں ان کے
چہروں پر ناچنے لگیں اور پھر وہ تینوں تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

شہزادی ہامون جادوگر کی قید میں

صدیوں پہلے کی بات ہے ملک فارس میں ایک عادل بادشاہ حکومت
کیا کرتا تھا۔ بادشاہ کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی آخر ایک دن لوگوں کی دعائیں بارگاہ

زدی میں منظور ہوئیں اور بادشاہ کے گھر ایک چاند جیسی حسین بیٹی پیدا ہوئی
س کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ جس کی پتلی بھوری اور ہلکی ہلکی نیلی آنکھیں تھیں
لئے بادشاہ نے شہزادی کا نام شہزادی نیلو رکھا۔ شہزادی کی تربیت بالکل
زادوں جیسی ہو رہی تھی کیونکہ بڑے ہو کر شہزادی نے ہی اس ملک کی باگ دوڑ
سنبھالنا تھی۔ وقت کا پہیہ تیزی کے ساتھ گھومتا رہا اور شہزادی سولہ برس کی ہو گئیں۔
ملک میں پہاڑوں پر ایک جادوگر اپنے بدصورت بیٹے کے ساتھ رہتا تھا وہ جانتا
ا۔ چند برس بعد اس ملک پر شہزادی نیلو کی حکومت ہو گی پھر کیوں نہ کوئی ایسی تدبیر
جائے کہ شہزادی کی شادی اس کے بیٹے کے ساتھ ہو جائے بہت سوچ بچار کے
جادوگر بھیس بدل کر بادشاہ کے محل میں شہزادی کی خدمت کے لئے نوکر ہو گیا۔

ایک دن شہزادی شکار پر جانے لگی تو وہ اس نوکر کو اپنے ساتھ لے گئی اور
بہت سی کنیزیں اس کے ساتھ تھیں۔ جادوگر اسی دن کے انتظار میں تھا اور آج
موقع اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ جب شہزادی کھیتوں میدانوں میں سے گزرتی
ایک جنگل میں داخل ہوئی اور شکار کی تلاش میں آگے بڑھی تو جادوگر جو کہ
گھوڑے پر ان سب کے پیچھے پیچھے تھا کوئی منتر پڑھا جس کے اثر سے ہوا بڑی
سے چلنے لگی اور دیکھتے دیکھتے ہی طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔ فضا میں گرد اتنی
گئی تھی کہ کوئی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور پھر اچانک شہزادی نے
س کیا کہ کوئی کود کر اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے شہزادی کے ہاتھ
گھوڑے کی باگیں چھین لیں اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی ہے۔ یہ جادوگر تھا شہزادی
بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ خود کو بچانے کے لئے گھوڑے سے کود جائے۔
یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ اس کا نوکر ہے جو اب اسے اغوا کر کے کہیں لے جانا
ہے مگر ہزار کوشش کے باوجود اس جادوگر کو نہ تو گھوڑے سے نیچے گرا سکی اور نہ

ہی گھوڑے سے خود کود گئی اور پھر جادوگر اسے پہاڑ پر اپنے قلعہ نما مکان میں لے گیا
اور ایک کمرے میں لے جا کر بند کر دیا ادھر طوفان تھمنے کے بعد شہزادی کی کنیزوں
اور محافظوں نے شہزادی کو بہت ڈھونڈا مگر جب انہیں شہزادی اور اس کی خادمہ نہ
ملے تو وہ واپس لوٹ آئیں اور بادشاہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے
ہزاروں سپاہی اس جنگل کی طرف دوڑا دیئے تا کہ شہزادی کو تلاش کر سکیں
سپاہیوں نے اس جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا مگر شہزادی کا کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ آخر سا
تھک ہار کر وہ بھی نامراد لوٹ گئے۔ بادشاہ اور ملکہ کا اپنی بیٹی کی جدائی میں برا
تھا۔

انہی دنوں عراق کا شہزادہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار پر نکلا۔ اس
بائیں ہاتھ پر اس کا پیارا باز بیٹھا ہوا تھا۔ شہزادہ بڑے وقار کے ساتھ سب لوگو
سے آگے آگے تھا۔ سورج ڈھلنے لگا تھا اور سورج کی تمازت میں خاصی کمی
ساتھ ٹھنڈی اور تیز ہوا چلنے لگی تھی ہوا میں بھینی بھینی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ شہزا
بڑا حیران تھا کہ یہ خوشبو کس طرف سے آ رہی ہے ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے
ایک ہرن نظر آیا شاید اس ہرن میں کستوری ہے جس کی وجہ سے فضا معطر ہو رہی ہے
اور پھر اس نے اپنا گھوڑا اس ہرن کے پیچھے ڈال دیا جو انہیں دیکھ کر چوکڑیاں
بھرنے لگا تھا۔ گو شہزادے کا گھوڑا برق رفتار تھا مگر ہرن کو تو جیسے پر لگ گئے ہوا
۔ وہ اتنی تیز دوڑنے لگا کہ شہزادے کا گھوڑا لحظہ بہ لحظہ دور ہونے لگا یہ دیکھتے ہو
شہزادے نے اپنے باز کو ہرن کے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا باز ہرن پر حملہ
کر کے اسے گرا لے گا اتنے میں وہاں پہنچ کر ہرن کو پکڑ لے گا اور پھر ہرن اچانک
۔ جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔
مگر شہزادے کو باز نظر آ رہا تھا جو برابر اڑتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا اور

پھر اچانک شہزادے نے دیکھا کہ کسی طرف سے ایک تیر آیا اور اسکا باز گھائل ہو کر
زمین پر آ رہا۔ شہزادہ گھوڑا بھگاتا ہوا اس طرف گیا تو وہاں اسے ایک اور ہی منظر
نظر آیا۔ ہرن تو غائب تھا البتہ ایک نہایت حسین عورت جس کے پاس تیر کمان تھا۔
ایک جگہ کھڑی تھی اسے دیکھ کر شہزادے کو بہت غصہ آیا۔ اس نے دیکھا اسکا باز
تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا اس باز نے میرے شکار پر حملہ کرنا چاہا تھا اس لئے میں
نے اسے ہلاک کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے وہ عورت جو نہایت خوبصورت تھی۔ ایک
سمت چل دی اور شہزادے کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نظروں سے غائب ہو گئی۔
شہزادہ نہ کچھ کہہ سکا۔ اس عورت کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ شہزادہ سحر زدہ ہو کر رہ
گیا۔ ایک خاص بات جو اس نے محسوس کی وہ یہ کہ اس عورت نے باتیں کرتے
ہوئے ایک بار بھی آنکھ نہ جھپکی۔
"یہ انسانی آنکھیں نہیں ہو سکتیں؟" شہزادہ بڑبڑایا اور پھر ہمت کر کے
اس طرف بڑھا جدھر وہ عورت گئی تھی مگر اسطرف دور دور تک اس عورت کا نام و
نشان نہیں تھا۔ آخر تھک ہار کر شہزادہ واپس ہوا اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی بس
پھر کیا تھا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا مگر شہزادہ راستہ بھول چکا تھا وہ سارا دن
گھوڑے کو ادھر ادھر بھگاتا پھرا مگر جنگل تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔
آخر شام ہو گئی اور وہ تھک ہار کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور اسے چرنے
کے لئے کھلا چھوڑ دیا اور خود کسی جنگلی پھلوں کے درخت کی تلاش کرنے لگا مگر اسے
کوئی بھی ایسا درخت نظر نہ آیا جس پر پھل لگے ہوتے نہ ہی کہیں کوئی پانی کا چشمہ
نظر آیا۔ آخر مجبور ہو کر وہ ایک درخت کے نیچے بھوکا پیاسا ہی لیٹ گیا۔
سارے دن کا تھکا ہارا ساری رات مزے سے سویا رہا۔ صبح جب آنکھ کھلی
تو خاصا دن چڑھ چکا تھا۔ اس کا وفادار گھوڑا اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ شہزادہ اٹھا

رخدا کا نام لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا بھی جیسے پہلے ہی سے واپسی کے لئے تیار تھا۔ اپنے مالک کے سوار ہوتے ہی بڑی تیزی سے دوڑ پڑا۔

اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ ایک جادوگر تھا مگر اپنے جادو کی وجہ سے اس نے خود کو جوان عورت بنا رکھا تھا ہرن کے روپ میں بھی وہی تھا اور اب وہ ایک ناگن کا روپ دھارے شہزادے کا پیچھا کر رہا تھا۔

دوپہر ہونے تک شہزادہ ایک ایسے مقام پر جا پہنچا جہاں ہزاروں برس پرانے کھنڈرات موجود تھے۔ شہزادے نے جب کھنڈرات کو دیکھا تو اس نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ یہ کھنڈرات ایک پہاڑی پر تھے۔ جس کے نیچے ایک چشمہ بھی بہہ رہا تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ چند درخت جنگلی پھلوں کے بھی تھے۔ نہیں دیکھتے ہی شہزادے کی بھوک چمک اٹھی۔ ان کے قریب پہنچتے ہی اس نے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا دی۔ پھلوں کے بوجھ سے ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں اور پھر شہزادے نے پھل توڑ توڑ کر کھانے شروع کیے۔ گھوڑا بھی گھاس چرنے لگا۔ جب شہزادے کا پیٹ خوب بھر گیا تو وہ چشمے کی طرف بڑھا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے ارے اور پیاس بجھائی ابھی وہ اٹھ کر پلٹا ہی تھا تو اپنے سامنے اسی عورت کو دیکھ کر سخت حیران ہوا بلکہ اس پر کچھ دہشت بھی طاری ہونے لگی۔ وہ عورت شہزادے کے سامنے یوں وقار میں کھڑی تھی جیسے وہ کوئی ملکہ اور وہ شہزادہ اسکے سامنے کوئی حقیر سا شخص ہو۔

''تم تو میرا شکار کر رہے تھے اور خود ہی شکار ہو گئے۔ یہ کہتے ہوئے اس جادوگر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اسکی آواز ان کھنڈرات میں بھی گونجی اور چمگادڑیں خوف کے مارے اڑنے لگیں۔ جنہوں نے ان کھنڈرات میں ڈیرے جمائے ہوئے تھے اور پھر ایک دم خوفناک سناٹا چھا گیا۔ شہزادہ جو چند لمحے پہلے اس

عورت کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ اس نے اپنے حواس درست کر لئے تھے اور اپنے اندر سے خوف کو بھگا دیا تھا اور اس نے ہر قسم کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو تیار کر لیا تھا۔ اس نے جادوگر کی بات کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور بولا ''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔''

''تم میرے پیچھے چلے آؤ یہ بات بھی تمہیں معلوم ہو جائے گی۔'' پہلے تو شہزادے نے سوچا تلوار میان میں سے نکال کر اس نابکار کی گردن اڑا دے مگر پھر کچھ سوچ کر وہ خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے چل دیا۔ جادوگر شہزادے کو لے کر ان کھنڈرات میں داخل ہوا اور پھر ایک جگہ جا کر جادوگر رک گیا اور اس نے کوئی منتر پڑھا جس کیساتھ ہی فرش کی ایک سنگ مرمر کی سل خود بخود دھسک گئی اور جادوگر زینہ اترنے لگا۔ شہزادہ بھی اس کے پیچھے ہو لیا وہ حیران تھا کہ باہر سے جو عمارت پوری طرح کھنڈر ہو رہی تھی۔ نیچے پوری طرح محفوظ اور شاندار فرنیچر سے آراستہ تھی جادوگر نے شہزادے کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شہزادہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جادوگر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر شہزادے سے یوں مخاطب ہوا۔ ''دیکھو اے شہزادے تمہیں یہاں تک لانے کا ایک خاص مقصد تھا۔

دراصل یہاں میرے پاس فارس کی شہزادی نیلو قید ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ میرے بیٹے سے شادی کر لے مگر میں جانتا ہوں کہ شہزادی میری بات پر کبھی رضامند نہیں ہوگی۔ میں کئی روز سے کسی شہزادے کی تلاش میں تھا اور پھر تم مجھے نظر آ گئے اور میں نہایت خوبصورت ہرن بن گیا تاکہ تم مجھے ہلاک کرنے کی بجائے زندہ پکڑنے کی کوشش کرو اور میں تمہیں یہاں تک لے آؤں۔ مگر تم شاید نہیں جانتے کہ جانوروں پر جادو کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور پھر تمہارا باز میرے تعاقب میں لگ گیا مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ اگر وہ مجھ پر جھپٹ پڑا تو کہیں میری

آنکھیں ہی نہ نوچ لے اسلئے میں اپنے اصلی روپ میں آ گیا اور تیر سے اسے ہلاک کر دیا اور پھر تم میرے پاس آئے۔ تم نہایت غصے میں تھے اسلئے مجبوراً مجھے تمہیں سحر زدہ کرنا پڑا تا کہ تم مجھے کوئی نقصان نہ پہنچاؤ اور پھر میں تمہاری نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ رات تم نے سو کر گزاری۔ دوسرے دن جب تم چلے تو تمہارا رخ اسی طرف تھا جدھر میں تمہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اور پھر میں ایک ناگن کے روپ میں تمہارا پیچھا کرتا یہاں لے آیا اب میں تمہیں اس شہزادی کے پاس لے کر چلتا ہوں میں تمہارا اپنے بیٹے کے طور پر تعارف کرواؤں گا مگر یاد رہے تم کوئی بات نہیں کرو گے۔ اسکے بعد تم آزاد ہو اور اپنے ملک چلے جانا۔''

یہ کہتے ہوئے جادوگر اٹھا اور کئی کمروں سے گزر کر وہ شہزادے کو ایک زندان میں لے گیا۔ جہاں روشندان کی روشنی میں سے شہزادے کی نظر اس شہزادی پر پڑی تو اس کا دل بھر آیا۔ اتنی حسین شہزادی کو جادوگر اپنے کسی بدصورت بیٹے سے بیاہ دے گا یہ سراسر ظلم ہے۔ شہزادی نیلو کی نظر جب شہزادے پر پڑی تو اس نے اس کے لباس سے پہچان لیا کہ یہ کوئی شہزادہ ہے اور جب جادوگر نے شہزادے کا تعارف اپنے بیٹے کے طور پر کرایا تو شہزادی کو یقین نہ آیا مگر وہ شہزادے کو دیکھ کر خوش بہت ہوئی اور پھر جادوگر شہزادے کو لے کر وہاں سے لوٹ آیا اور اسے اس کمرے میں بٹھایا اور بولا۔ ''اے شہزادے تمہارا کام ختم ہوا اب تم یہاں سے چلے جاؤ اور ہاں پلٹ کر نہ آنا۔ ہو سکتا ہے تمہارے دل میں شہزادی کے لئے رحم پیدا ہو گیا ہو مگر یاد رکھنا اگر تم نے واپس آ کر شہزادی کو چھڑانے کی کوشش کی تو سوائے تباہی کے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا یہ میں تم سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم میری قوت سے واقف نہیں ہو۔ میرا نام جبار جادوگر ہے۔ اگر چاہتا تو تمہیں ابھی ہلاک کر سکتا تھا یا کوئی جانور بنا کر در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتا مگر تم میرے کام آئے ہو

اس لئے تم یہاں سے صحیح سلامت جا رہے ہو۔

شہزادہ خاموشی کے ساتھ کھنڈر سے باہر نکل آیا اس کے جاتے ہی جادوگر شہزادی کے پاس گیا اور بولا ''کہو لڑکی تمہیں میرا بیٹا پسند آیا۔ میں اس کے ساتھ تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ شہزادی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جادوگر نے اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھا اور بولا ''شادی تو تمہاری ہو جائے گی مگر میرے بیٹے کی پیدائش پر نجومیوں نے بتایا تھا کہ جب میرے بیٹے کی شادی ہو گی تو دلہن کی اس پر نظر پڑتے ہی میرا بیٹا نہایت بدصورت ہو جائے گا۔ اس لئے میں اس کے جوان ہونے پر جب اس کی شادی کروں تو شادی کے وقت اس لڑکی کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہونی چاہئے اور شادی کے بعد وہ لڑکی تمہارے بیٹے کو چالیس دن تک نہ دیکھے وہ دونوں جب بھی ملیں تو اندھیرے میں ملیں۔ تم نے میرے بیٹے کو دیکھ لیا ہے۔ اب تم دونوں ایک اندھیرے کمرے میں رہو گے کہو منظور۔'' شہزادی اب بھی خاموش رہی اور جادوگر وہاں سے خوشی خوشی چلا گیا۔

شہزادہ اس کھنڈر سے باہر نکل تو آیا مگر اس نے طے کر لیا تھا کہ خواہ اس کو اپنی جان کی ہی بازی کیوں نہ لگانی پڑے وہ شہزادی کو آزاد کرائے گا۔ اس نے شہزادی کے کمرے میں روشندان تو دیکھ لیا تھا اور کھنڈر کے باہر سے اندازہ بھی کر لیا تھا کہ وہ کمرہ کدھر ہے اور پھر وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر اس روشندان تک جا پہنچا۔ اس نے دیکھا شہزادی نیلو اپنا سر گھٹنوں میں دے کر کسی سوچ میں گم ہے۔ جادوگر وہاں سے جا چکا تھا اور پھر اس نے ایک کنکر اٹھا کر اس کمرے میں پھینکا۔ شہزادی نے گھبرا کر اس طرف دیکھا تو وہاں شہزادے کو پایا۔ شہزادے نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

روشندان سے نیچے فرش اتنا نیچے تھا کہ بغیر رسی کے شہزادی کو اوپر کھینچنا نہیں

جا سکتا تھا پہلے تو شہزادے نے روشندان کی سلاخیں ایک بڑے پتھر کی مدد سے اکھیڑ دیں اور پھر اس نے اپنی پگڑی اتاری اور اس کا ایک سرا نیچے پھینک دیا اور شہزادی کو اس کے سہارے اوپر آنے کو کہا اور پھر اس نے اس پگڑی کے سہارے شہزادی کو اوپر کھینچ لیا مگر ابھی وہ سنبھلا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک زبردست پھنکار سنائی دی۔ شہزادے نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں ایک بہت بڑی ناگن اپنا پھن اٹھائے کھڑی تھی جسے دیکھ کر شہزادی خوفزدہ ہو گئی مگر شہزادہ ذرا بھی نہ گھبرایا وہ سمجھ گیا کہ ناگن کے روپ میں جادوگر ہے اس نے نہایت پھرتی سے تلوار نکالی وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اس ناگن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو وہ پھر اس کے جادو کے اثر میں آ جائے گا اس لئے اس نے خود کو اس کو نظروں سے بچائے رکھا اور بڑھ بڑھ کر وار کرنے لگا۔ مگر جادوگر بوڑھا ہونے کے باوجود نہایت پھرتی سے جھکائی دے کر خود کو بچا لیتا اور اچھل کر اسے ڈنگ مارنے کی کوشش کرتی۔ مگر شہزادہ کامیاب رہا اس کا ایک ہاتھ ایسا پڑا کہ ناگن کا سر تن سے جدا ہو گیا اور پھر ان لوگوں نے دیکھا جادوگر اپنے اصلی روپ میں پڑا تڑپ رہا ہے اور مر گیا۔

اب وہ دونوں جلدی سے وہاں سے چلے تا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے بھاگ جائیں مگر ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ان دونوں نے اپنے سامنے ایک دیونما شخص کو دیکھا جو ایک آنکھ سے کانا تھا اور اس کا چہرہ نہایت خوفناک نظر آتا تھا۔ یہ جادوگر کا بیٹا تھا مگر شہزادہ ذرا بھی خوفزدہ نہ ہوا اور اس نے جادوگر کے بیٹے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں اس دیو کو ہلاک کر دیا اور پھر شہزادے نے شہزادی کو اپنے پیچھے گھوڑے پر سوار کر لیا اور ملک فارس کی طرف چل دیا۔

کئی دنوں کی مسافت کے بعد وہ فارس کی حدود میں داخل ہوا۔ تو سرحد

کے محافظ ان دونوں کو ایک جلوس کی شکل میں بادشاہ کے پاس لے گئے جو اپنی بیٹی کی گمشدگی کی وجہ سے سخت پریشان تھے اور پھر شہزادی نے بادشاہ کو تمام واقعہ کہہ سنایا کہ کس طرح جادوگر نے جو اس کے محل میں ملازم ہوا کرتا تھا اسے اغوا کیا اور لے جا کر قید کر لیا اور کس طرح شہزادے نے اسے بچایا۔

بادشاہ نے شہزادے کا شکریہ ادا کیا اور اسے کئی روز اپنے پاس مہمان رکھا اور پھر ایک دن شہزادہ وہاں سے رخصت ہو کر اپنے وطن آ گیا۔

☆☆☆

کالی موت

دیپال پور پہاڑی سلسلہ کے دامن میں واقع ایک خوب صورت گاؤں ہے۔ جہاں کے محنت کش لوگ پہاڑی سلسلہ کے چھوٹے چھوٹے خطوں پر جوار، باجرہ اور مکئی کاشت کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ گاؤں کے ایک طرف پہاڑی پر ایک ریسٹ ہاؤس تھا۔ جہاں دور دور سے آئے ہوئے سیاح ٹھہرتے تھے۔ دیپال پور سے چند کوس دور رام پور اسی طرح کا اور ایک گاؤں تھا۔ سردی کی وجہ سے سورج غروب ہوتے ہی لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ہنستا بستا گاؤں ایک خاموشی میں ڈوب جاتا۔

اسی طرح ایک رات ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک گاؤں پر چھائی ہوئی خاموشی کو خوفناک بنا رہی تھی۔ اچانک پہاڑی سلسلہ سے چند گھوڑ سوار نمودار ہوئے۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ ان میں سے چند نے روشن مشعلیں پکڑی ہوئی تھیں۔ مشعلوں کی ناکافی روشنی میں ان کے کالے کپڑے میں

لپٹے ہوئے چہرے بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ ان کا رُخ دیپال پور کی طرف
تھا۔

پھر تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کی گلیاں گھوڑوں کی ٹاپ سے چیخ اُٹھیں۔
مکانوں کے دروازے دھڑا دھڑ ٹوٹنے لگے۔ مزاحمت کرنے والے کی چیخ فضا
میں بلند ہوئی اور پھر اس کا مکان شعلوں کی لپیٹ میں آجاتا۔ گاؤں کی فضا بچوں کی
چیخ و پکار سے گونج اُٹھی۔ لیکن ان کی مدد کے لئے کوئی نہ آسکا۔ صرف ان کی چیخ و
پکار کے بدلے میں گھوڑسواروں کے قہقہے بلند ہوجاتے۔ گاؤں کے مکان دھڑا دھڑ
جلنے لگے۔ گھوڑسوار گاؤں میں اپنی آمد کے نشان چھوڑ کر گاؤں والوں کا مال و
اسباب لوٹ کر چلتے بنے۔

سیاہ بادلوں نے چاند کو اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔ اور پھر مکانوں سے
اُٹھتے ہوئے شعلے بارش کی تیزی میں ٹھنڈے پڑنے لگے۔
کالکا ڈاکو۔۔۔۔ کالکا۔۔۔۔ کالکا میں تنگ آچکا ہوں۔ یہ نام سُن کر
تیسرا گاؤں ہے جو اس کے ظلم وستم کا نشانہ بنا ہے۔ لیکن تم لوگ ابھی تک
اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکے۔ آخر کیوں؟ کیا وہ جادوگر ہے؟ جو تم لوگوں کے
پہنچنے سے پہلے ہی وہ غائب ہوجاتا ہے۔ تم لوگوں کی بے بسی کی وجہ سے وہ کتنی بار
دلیری سے لوٹتے ہوئے ہر مکان کے دروازے پر اپنا نام لکھ جاتا ہے۔
کالکا۔۔۔ کالکا۔۔۔ آئی جی صاحب نے غصّے سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے
کہا!

اس وقت کالکا کے ظلم کا نشانہ بننے والے تمام گاؤں کے سب انسپکٹر اور
انسپکٹر آئی جی پولیس کے آفس میں اکٹھے ہوئے تھے اور آئی جی صاحب ان کی
ناکامی پر خوب گرج رہے تھے۔

خیر کب تک کالکا بچے گا۔ میں نے انسپکٹر عرفان اور سارجنٹ نعمان کو رام
پور بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ کالکا کو نیست و نابود کر کے چھوڑیں گے۔ کالکا کا
اگلا نشانہ رام پور ہی ہوگا۔
آئی جی صاحب نے تقریر ختم کر کے ان سب کو جانے کے لئے کہا تو سب
نے سکھ کا سانس لیا۔ آئی جی صاحب کے بلاوے سے سب کا خون خشک ہورہا تھا
کہ آئی شامت! کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی کالکا سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں رکھتا
تھا۔

آخر آپ کو یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی جو آپ نے رام پور جانے کی حامی
بھر لی۔ سارجنٹ نعمان نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے انسپکٹر عرفان سے پوچھا۔
کیا وہاں کے سب انسپکٹر مر گئے ہیں۔
نہیں یہ بات نہیں کالکا کی وحشت ہی اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ مقامی پولیس
انسپکٹر اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے ہیں۔
انسپکٹر عرفان نے جواب دیا۔
اچھا! اس لئے ہمیں چارہ بنا کر بھیجا جارہا ہے کہ کالکا آئے اور ہمیں چٹ
کر جائے۔ اچھے بھلے شہر میں کام کر رہے تھے۔ سارجنٹ نعمان نے گھوڑے کو ایڑ
لگاتے ہوئے کہا۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کیونکہ پہاڑی راستہ شروع ہوچکا
تھا۔

بے وقوف اگر ہمیں ملک و ملّت کے لیے کام کرنا ہے تو چاہے شہر ہو یا
گاؤں۔ ہمارے لیے سب ایک ہی ہیں۔ اور ایک فرض شناس سپاہی کے لئے
ضروری ہے کہ جب ملک و ملّت کے لیے لڑے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑے۔ کیا
تمہیں وہ قول یاد نہیں۔ ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر

ہے۔"

وہ تو ٹھیک ہے۔لیکن یہ گھوڑا تو تیز چلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔نعمان نے ب
کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

ابھی تیز ہو جاتا ہے۔انسپکٹر عرفان نے نعمان کے گھوڑے کو پاؤں
ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

سارجنٹ نعمان کا گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔نعمان سے سنبھلنا مشکل ہو
تھا۔گھوڑے نے ایک چنن سے چھلانگ لگائی اور سارجنٹ نعمان کو گراتا ہو
جا۔۔۔ وہ جا۔

انسپکٹر عرفان گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کے قریب آئے اور اُسے اُٹھای
نعمان کراہ رہا تھا۔آخر یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے کہ مجھے بھی گروا دیا اور گھوڑا
بھگوا دیا۔جائے گا کہاں؟ یہیں کہیں ہوگا۔

عرفان مسکراتے ہوئے بولا۔اور منہ سے سیٹی بجائی تو زاہد کا گھوڑا ہنہنا
ہوا واپس آگیا۔

یہ کیا نعمان نے گھوڑے کی پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

یہ ہمارے محکمہ کے ٹرینڈ گھوڑے ہیں سمجھے۔انسپکٹر عرفان نے مسکرا کر کہا۔

اب انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور تیزی سے دولت پور کے
طرف بڑھنے لگے۔اور شام کے وقت دولت پور پہنچے۔رات وہاں کی چوکی میں
گزاری۔اور صبح ہوتے ہی دیپال پور کا رُخ کیا۔

دیپال پور پہنچ کر انھیں بڑی تکلیف ہوئی کیونکہ وہاں کے کئی مکان جل
کر زمیں بوس ہو چکے تھے۔کئی آدمی مارے گئے۔لٹے ہوئے مکانوں کے
دروازے جن پر لکھا ہوا "کاکا" ان کو منہ چڑا رہے تھے۔

پولیس چوکی پہنچ کر انسپکٹر عرفان نے آئی جی صاحب سے وائرلیس پر بات
کی کہ دولت پور کی پولیس چوکی کے تمام سپاہی واپس بلا لئے جائیں اور تقریباً پانچ
سو کے قریب ایسے پٹاخے جو پاؤں پڑتے ہی پھٹ جائیں۔بھیجے جائیں۔

آئی جی صاحب انسپکٹر عرفان کی بات سن کر بہت حیران ہوئے۔کہنے لگے
مگر تم دونوں کیا کرو گے۔جب کہ تمام سپاہی واپس آ گئے۔
آ گئے تو؟

آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے نا۔پھر آپ فکر نہ کریں۔صرف پٹاخے بنڈلوں
میں بھیج دیں۔یہ آپ کے اور میرے سوا کسی اور کو معلوم نہ ہونا چاہیے۔انسپکٹر
عرفان نے جواب دیا۔

جیسے تمہاری مرضی! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔آئی جی صاحب نے سلسلہ
منقطع کرتے ہوئے کہا۔

دوپہر تک پولیس گاڑی پٹاخوں کے ڈبے لے کر سپاہیوں کو واپس لانے
کے لئے پہنچ جائیں گی۔

انسپکٹر عرفان سارجنٹ نعمان اور گاؤں کے تمام لوگ گاؤں کے سردار کے
گھر میں جمع ہوئے تھے۔پولیس کی گاڑی چوکی سے سردار کے گھر پہنچائی گئی۔پھر
شام سے پہلے پولیس گاڑی سپاہیوں کو واپس لے کر ہیڈ کوارٹر آ گئی۔

"دو! آہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا صرف دو آدمی وہ بھی کاکا کے مقابلے پر
حیرت کی بات ہے۔ہزاروں تو مقابلے میں ٹھہرے نہیں یہ دو کیا کر لیں گے۔
آج رات ہم ان کو دیکھ لیں گے کہ ہمارا راستہ کیسے روکتے ہیں۔

کالے سیاہ گھنگریالے بال سیاہ رنگ اور اس پر سیاہ لباس نے اس کی
شخصیت کو اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔وہ اس وقت ایک غار میں اپنے ساتھیوں کے

ساتھ پرسوں کی کامیابی کا جشن منا رہا تھا کہ ایک بوڑھا لکڑی ٹیکتا ہوا غار میں دا
ہوا۔ اور اندر آتے ہی اس نے لکڑی ایک طرف پھینکی اور سیدھا کھڑا ہو گیا
سفید داڑھی اُتارتا ہوا بولا "میں گاؤں کی خبر گیری کے لئے گاؤں گیا تھا۔ باس ک
اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"شکر ہے کیا خبر لائے ہو دولت پور کی؟ نقلی بوڑھا جو کہ اب ایک نوجوا
کی شکل میں کالکا کے سامنے کھڑا تھا۔ بولا!

"باس! انسپکٹر عرفان اور سارجنٹ نعمان نے گاؤں کے تمام پولیس
والے واپس بھیج دیئے ہیں۔ دولت پور کا سردار کسی بات پر انسپکٹر سے متفق نہ تھا
لیکن انسپکٹر نے آخر اسے راضی کر لیا تھا۔ آج رات صرف دونوں ہی گاؤں کا پہر
دیں گے اور آ[illegible]۔"

آج رات تو ان دونوں کی زندگی کی آخری رات ہوگی شکر ہے شاید آ
جی نے انھیں غلط فہمی میں رکھ کر میرے مقابلے کے لیے بھیجا ہے۔ آؤ! تم بھی جش
مناؤ۔ آج رات کامیابی کے لیے!

پولیس بس پولیس ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں کھڑی کر کے بس ڈرائیو
تقریباً بھاگتا ہوا آئی جی صاحب کے دفتر کی طرف بڑھا اور اجازت لے کر اند
داخل ہوا اور انسپکٹر عرفان سے لایا ہوا خط آئی جی صاحب کو پیش کیا۔ آئی جی نے خ
پڑھ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور ڈرائیور کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ اب بس کے آگے ان
کی کار اور پولیس بس کے پیچھے ایک جیپ میں مسلح پولیس والے اور ان کا رُخ آئی
جی کی کوٹھی کی طرف تھا۔ کوٹھی کے احاطے میں پہنچ کر تمام سپاہی اتر کر اندر چلے
گئے۔

شام ہوتے ہی انسپکٹر عرفان اور نعمان بہت مصروف تھے۔ گاؤں کا سردا

ی ان کے ساتھ تھا۔ انسپکٹر عرفان نے گاؤں والوں کی مدد سے تمام پٹاخے گاؤں
گلیوں میں بکھیر دیئے اور خود گاؤں کے باہر ایک چٹان کی اوٹ میں کالکا کا
نتظار کرنے لگے۔ جہاں یہ دونوں کھڑے تھے وہاں سے بخوبی پورا گاؤں نظر آتا
۔

آدھی رات کے وقت اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں ان کے
انوں سے ٹکرائیں تو انسپکٹر عرفان اور سارجنٹ نعمان ہوشیار ہو گئے۔ آہستہ آہستہ
آوازیں قریب ہونے لگیں۔ جلد ہی گھوڑ سوار ان کی نظروں میں آ گئے آج کالکا
نے تین اطراف سے گاؤں پر حملہ کیا تھا۔

یونہی کالکا کے ساتھیوں کے گھوڑے گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوئے
زمین پر بکھرے ہوئے پٹاخوں کی آوازیں جو گھوڑے کے ٹاپ پڑنے سے چھٹنے
لگے۔ گھوڑے بدک بدک کر اپنے سواروں کو زمین پر گرا رہے تھے اور بھاگ رہے
تھے۔ گرے ہوئے کچھ ڈاکو تو اپنے ہی گھوڑوں کے نیچے آ کر کچل گئے اور جو جو باقی
بچے وہ جان بچانے کے لئے جس گھر میں داخل ہوتے تو اندر تنی ہوئی بندوقیں ان
کا انتظار کرتیں۔

ایک ہنگامہ برپا تھا۔ پٹاخوں اور ڈاکوؤں کی چیخوں سے کان پڑی آواز
سنائی نہ دیتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں بازی اُلٹ گئی۔ پٹاخے پھٹ رہے تھے۔
گھوڑے بھاگ رہے تھے۔ گھوڑ سوار گر رہے تھے۔

کالکا یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ گاؤں والوں کو تو لڑائی آتی نہیں تھی تو پھر یہ فائر
کون کر رہا ہے۔ اور گھروں کے اندر بندوقیں تانے کون ہیں۔

مجبوراً اُسے بھاگنا پڑا۔ بھاگ ہی رہا تھا کہ ایک چٹان سے ایک سایہ کالکا
کو دکھائی پڑا۔ اور دونوں ہی بُری طرح ایک دوسرے سے چمٹے لڑ رہے تھے۔ جلد

ہی کالکا کو معلوم ہو گیا کہ اس کا حریف اس سے زیادہ طاقت ور ہے تو وہ بھاگنے کی سوچنے لگا۔

کالکا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دوسرا سایہ اس پر حملہ آور ہوا۔ اور دونوں سائے اس پر بری طرح ٹوٹ پڑے۔ کالکا نے جلد ہی ہاتھ پیر چھوڑ دیئے۔ ذرا دیر میں پہلا سایہ اُٹھ کر دوسرے کے قریب آ کر بولا۔ نعمان تم ٹھیک ہو۔ آپ سنائیں۔ آپ کے چوٹ تو نہیں آئی۔ نعمان نے انسپکٹر عرفان سے پوچھا۔ پھر دونوں کالکا کو باندھے گھوڑے پر رکھ کر گاؤں کی طرف چل دیئے۔

خاموشی چھاتے ہی گاؤں کے تمام لوگ گھروں سے باہر آ گئے۔ کالکا کے آدھے ساتھی مارے گئے۔ باقی گاؤں والوں نے پکڑ لئے۔

اب انسپکٹر عرفان اور نعمان کے ساتھیوں کو ان دونوں کی تلاش ہوئی۔ ابھی وہ انہیں گاؤں میں تلاش کر رہے تھے کہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز پھر سنائی دی۔ سب بھاگتے ہوئے اس طرف بڑھے۔ دو گھوڑے آتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے بندوقیں سیدھی کر لیں۔

لیکن انسپکٹر عرفان کی آواز سن کر وہ سب رک گئے۔ قریب آ کر سب انہیں معلوم ہوا کہ کالکا [illegible] دیکھا تو گاؤں والے خوشی سے ناچنے لگے۔ انسپکٹر عرفان نے اپنے سپاہی اکٹھا کئے تو [illegible] سپاہی [illegible] گاؤں والوں میں شامل ہو گئے تھے۔ تو کیا [illegible] پاس واپس [illegible] گئے تھے۔ کالکا نے انسپکٹر عرفان سے پوچھا۔

نہیں میں نے سپاہی واپس نہیں بھیجے تھے۔ وہ تو گاؤں کی عورتیں تھیں جو سپاہیوں کی وردیوں میں شہر گئی ہیں اور اب بھی آئی جی صاحب کی حفاظت میں ان کی کوٹھی میں ہیں۔

ٹیلیفون ملتے ہی وہ بھی پہنچنے والے ہیں لیکن وہ گولیاں کون چلا رہا تھا۔ جس سے میرے ساتھیوں کے گھوڑے بدک گئے تھے۔ انسپکٹر نے کالکا کے پاؤں کے قریب پڑے ایک پٹاخے پر زور سے پاؤں مارتے ہوئے جواب دیا یہ تھا۔ کالکا پٹاخے کی آواز سے گھبرا گیا اور سب گاؤں والے ہنسنے لگے۔ دوسرے دن تمام گاؤں والے ایک جلوس کی شکل میں انسپکٹر عرفان اور نعمان کو رخصت کرنے آئے۔

☆☆☆

آدم خور

ٹر ٹر ٹر گھنٹی بجی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر دالان میں آیا۔ دروازے کی کھڑکی کے اوپر سے مجھے ایک پچاس سالہ خوبصورت شخص کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی چڑھی ہوئی مونچھیں اوپر کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔

"بھائی شہزاد صاحب آداب عرض ہے۔"

مجھے صورت جانی پہچانی نظر آئی لیکن میں پوری طرح پہچان نہ سکا۔ سلام کے انداز سے مجھے کوئی [illegible] دروازہ کھولا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ [illegible] حیران تھا۔ [illegible] سے بولا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں شہزاد بھائی؟ ارے میں بشیر خان ہوں [illegible] شکاری [illegible] "[illegible] برس کے اندر ہی بھول گئے؟"

وہ بولا۔ جی ہاں۔ میں وہی بشیر خان ہوں۔ ابھی تک ہندوستانی ہوں۔ [illegible] پاکستان گھومنے آیا تھا۔ [illegible] نہیں ہوا؟"

میں نے کہا ''نہیں تو ہمدرد نونہال کے لئے کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔'' وہ بولا'' تو میرے بچپن کے شکار کا واقعہ لکھ دیجئے۔ عجیب وغریب داستان ہے۔ بچپن میں میں ایک ٹیلے کے پیچھے چھپ کر ڈھیلے بازی کرتا تھا لہٰذا کسی کو پتا نہ چل سکا۔ میرا نشانہ جم گیا۔ اب میں نے بکریوں کے ریوڑوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ یقین مانئے شہزاد بھائی میرا پہلا ہی نشانہ ٹھیک بیٹھا اور ایک کالی موٹی سی بکری کی ٹانگ زخمی ہو گئی اب بجائے مرغیوں کے بکریاں اور بھیڑیں میرا نشانہ بننے لگیں۔ گاؤں والے پریشان ہو گئے۔ لیکن ان کو پتا ہی نہ چل سکا کہ یہ شرارت کرنے والا کون ہے۔

میری آٹھ سال کی عمر تھی کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد پھیری پر گئے ہوئے تھے۔ گاؤں کے ایک لوہار رحمو نے جن کو میں چچا کہتا تھا' اور گاؤں والوں نے مل کر تجہیز وتکفین کی اور گاؤں کے مکھیا نے مجھے رحمو چچا کے سپرد کر دیا۔ رحمو چچا کی بھی بیوی مر چکی تھیں۔ کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ رحمو چچا اپنی دکان پر دن رات بھٹی کے سامنے بیٹھے ہوئے کڑھائیاں' توے چمٹے اور سنسیاں بنایا کرتے تھے۔ جن کو پندرہ روز کے بعد وہ ایک دوسرے گاؤں میں پندرہ روز بازار لگنے پر فروخت کرنے جایا کرتے تھے۔

میں نے کہا'' تمہارے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوا؟''

وہ بولا'' رحمو چچا بھٹی ہی پر موٹی موٹی روٹیاں پکا لیتے تھے۔ سبزی بنا لیتے تھے اور میں اور وہ دونوں کھا لیا کرتے تھے۔ خلاف معمول والدہ کے انتقال کے ایک مہینہ بعد والد صاحب گاؤں آئے اور والدہ کی قبر پر جا کر بہت روئے۔ مجھے ہدایت کی کہ میں رحمو چچا کے ہاں ہی قیام رکھوں۔ وہ پھر چلے گئے اور ایک ہفتے کے بعد جب واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک عورت اور ایک لنگڑا جوان آدمی تھا جس

کو انہوں نے میرے گھر میں بسا دیا۔ مجھے رحمو چچا سے معلوم ہوا کہ وہ میری سوتیلی ماں ہے۔'' میں نے کہا'' تم کو رنج ہوا ہو گا؟'' وہ بولا'' جی نہیں' میرا اس کا واسطہ ہی نہیں پڑا۔ میں دن بھر جنگل کی طرف نکل جانے لگا۔ میری نشانہ بازی کا ذوق مجھے مجبور کرتا تھا۔ جنگل کا انتخاب میں نے یوں کیا کہ کسی نہ کسی دن گاؤں والوں کو اس کا علم ضرور ہو جاتا تھا کہ بکریوں اور بھیڑوں کو زخمی کرنے والا شریر میں ہی ہوں۔

میں نے جنگل کے ابتدائی حصے میں ایک ٹیلے کو اپنی نشانہ بازی کا مرکز بنا کر ڈھیلے مارنا شروع کئے اور میں خوشی سے اچھل اچھل پڑتا تھا۔ جب میرا نشانہ ٹھیک ٹھیک بیٹھ جاتا تھا۔ اتفاقاً پہلے ہی دن مجھے کوئی اپنے سے پچاس گز دور ایک مرغابی بیٹھی ہوئی ملی۔ غالباً اس حصے میں کوئی بڑا جوہڑ تھا۔ میں نے ایک بڑا سا ڈھیل اٹھا کر آہستہ آہستہ اس کے قریب جانا شروع کیا۔ تقریباً بارہ چودہ گز رہ گیا تو میں نے وہ ڈھیلا مرغابی کے اوپر پھینکا۔ ڈھیلا اس کے بازو پر پڑا اور درد کی شدت سے اس نے لوٹنا شروع کیا۔ میں تیزی سے لپکا اور اسکی ٹانگوں کو ہاتھ میں دبا کر اس کو اٹھائے ہوئے سیدھا چچا رحمو کی دکان پر پہنچا۔ چچا رحمو مرغابی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جلدی سے انہوں نے اس کو ذبح کیا۔ پر نوچے' اس کو صاف کیا اور گھر سے نمک مرچ تیل لا کر بھٹی پر بھوننا شروع کیا۔ ہم دونوں نے اسکا گوشت مزے لے لے کر کھایا۔ چچا نے مجھ سے کہا تم نے یہ مرغابی کیوں کر پکڑی؟''

میں نے صفائی کے ساتھ اپنی نشانہ بازی کا حال بتایا۔

دوسرے دن مجھے واقعی ایک غلیل مل گئی اور لوہے کے پچاس ساٹھ ٹکڑے جن کو چچا نے ایک تھیلے سے بھر کر مجھے دے دیا اور غلیل چلانے کی ترکیب بھی سمجھا دی۔ میں نشانہ باز پہلے تھا۔ محض ان کے بتانے پر میں نے غلیل سے ایک درخت پر

بیٹھی ہوئی چڑیا کو فوراً ہی مار گرایا۔ چچا خوش ہو گئے۔ اب میں روزانہ جنگل صبح ہی پہنچ جانے لگا۔ غلیل کی موجودگی میں مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ ہر روز میں کوئی نہ کوئی مرغابی یا تیتر یا دس پانچ بٹیر ضرور [illegible] لگا۔ اور یوں ہم چچا بھتیجا گوشت خور بن گئے۔ غلیل کی وجہ سے میں کافی [illegible] چڑیوں کو گرا لیتا تھا۔ [illegible] میں بے خوف جنگل میں دور تک نکل جانے لگا۔ میرا جسم تیزی کے ساتھ نشوونما پانے لگا۔ ایک دن میں جنگل میں کافی دور نکل گیا کہ مجھے ہرنوں کا ایک ریوڑ نظر پڑا۔ میں نے ایک ہرن پر غلیل چلائی میرا لوہے کا غلہ اس کے ماتھے پر بیٹھا اور [illegible] نے گر کر تڑپنا شروع کیا میں نے اس ہرن کو جس کا وزن ایک من سے کسی طرح [illegible] تھا اور وہ زندہ بھی تھا۔ اپنے اوپر لاد لیا اور جب میں اس کو لے کر چچا کی دکان پر لے کر پہنچا تو رحمو چچا مارے خوشی کے ناچنے لگے۔ میری پیٹھ ٹھونکی۔

مجھے چچا کے ساتھ رہتے ہوئے پانچ [illegible] ہو گئے تھے میرے والد بھی کبھی آ کر مجھے دیکھ جایا کرتے [illegible] کا [illegible] نہیں کیا۔ جنگل کی تمام ہیبت اور تمام خوف میرے دل سے نکل گیا [illegible] پختہ سے پختہ اور کامل سے کامل تر ہوتا گیا۔ میرا [illegible] تک سیر اور چھیچڑے [illegible] تھا۔ [illegible] میں کئی بار مار چکا تھا جن کی کھال چچا نے اتار کر [illegible] لی تھی۔ گوشت گاؤں کے کتوں کو ڈال دیا تھا۔ آپ کو تعجب ہوگا [illegible] بھائی تیرا سال کی عمر میں اٹھارہ سال کا نوجوان نظر آتا تھا [illegible] خوراک جنگل کی آب و ہوا، پرسکون اور آزاد زندگی نے مجھے قبل از وقت [illegible] میں اپنے جسم میں بے پناہ طاقت بھی محسوس کرتا تھا۔"

ایک گاؤں میں شور اٹھا کہ [illegible] شیر اٹھا لے گیا ہے۔ وہ ریوڑ کے ساتھ شہر واپس آ رہا تھا [illegible] تھا [illegible] آئے

پر گاؤں والے لاٹھیاں لے لے کر اس راستے پر بڑھے۔ ابھی سورج ڈوبنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ ان لوگوں نے جس مقام پر شیر نے چرواہے کو پکڑا تھا۔ اس مقام پر خون کا لوتھڑا دیکھا اور شیر اپنے شکار کو منہ میں دبا کر جس طرف لے گیا تھا خون کے دھبے برابر نظر آ رہے تھے۔ کوئی ایک میل تک انہیں خون کے دھبے نظر آتے رہے یہاں تک کہ انہیں کبڑے کی ادھ کھائی ہوئی لاش ملی۔ گاؤں بھر میں کہرام مچ گیا۔

تقریباً دو میل خون کے نشانات کے سہارے سب لوگ ایک مقام پر نکلے جہاں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ انہیں جھاڑیوں کے درمیان کبڑے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پیر اور ایک ہاتھ غالباً شیر نے کھا لیا تھا۔ منظر بڑا خوف ناک تھا۔ تینوں شکاری اسی مقام پر رک گئے اور لاش کے قریب تین درختوں پر مچانیں باندھنے کا حکم دے کر وہ لوگ واپس ہوئے۔ میں بھی چلا آیا۔ میں نے چچا سے ذکر کیا کہ میں شیر کا شکار دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بولے" ٹھیک ہے۔ لیکن تم رات میں کیوں کر جا سکو گے۔ ان شکاریوں کے پاس تھرماس میں چائے ہوتی ہے، ٹارچ ہوتی ہے بندوقیں ہوتی ہیں۔ چائے پی پی کر وہ رات جاگ کر بسر کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا" چچا کوئی ایسی دوا تم کو نہیں معلوم جس کو کھا کر نیند نہ آئے؟" وہ بولے" معلوم تو ہے۔ سامنے کی جھاڑیوں میں جو کالی کالی ہر بلیاں لگی ہوئی ہیں، ان کو کھا لو رات بھر نیند نہیں آئے گی لیکن یہ انتہائی کڑوی اور بدمزہ ہوتی ہیں۔ ان کو جانور تک نہیں چھوتے۔"

یقین جانیے مجھے ذرا برابر بھی خوف نہیں تھا۔ قریب آدھی رات تک وہ لوگ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ سگریٹوں پر سگریٹیں جلاتے رہے۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں [illegible] بولتی رہیں مگر مجھ پر ذرا برابر بھی خوف

طاری نہیں ہوا۔ چین بہ آرام درختوں کی شاخوں پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ رات کافی گزر گئی۔ شکاریوں کی باتیں بھی بند ہو گئی۔ غالباً وہ اونگھ گئے ہوں گے لیکن میری آنکھوں میں نیند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں آرام سے بیٹھا ہوا جاگ رہا تھا۔ یکا یک بندروں کی آوازیں مسلسل آنا شروع ہوئیں۔ میں سمجھ گیا کہ شیر کو دیکھ کر بندر خوف کھا رہے ہیں۔ میں چوکنا ہو گیا۔ پتوں پر بھاری قدموں کی آواز قریب سے قریب تر آنا شروع ہوئی۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی تھیں۔ میں نے ایک جانب سے شیر کو آتے دیکھا۔ وہ آیا اور لاش کے پاس بیٹھ کر آرام سے لاش کو کھانے لگا۔ ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً کسی شکاری کی آنکھ کھل گئی۔ ٹارچ کی روشنی یکا یک ہالہ بیٹھے ہوئے شیر پر پڑا۔ وہ روشنی میں نہا گیا۔ ایک فائر کی آواز ہوئی۔ لیکن غالباً گولی شیر کو نہیں لگی۔ وہ اور سے ڈھکا اور جس طرف کی مچان سے فائر ہوا تھا۔ اس پر اس نے زمین سے پیٹ لگا کر جست لگائی۔ دوسرے درختوں پر بیٹھے ہوئے دونوں شکاریوں کی ٹارچیں بھی شیر پر اس وقت پڑ رہی تھیں۔ شیر نے پہلے فائر والے کی مچان پر اپنا پنجہ اس طاقت سے مارا کہ مچان ٹوٹ گیا اور میں نے شکاری کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔

اس موقع پر دوسرے شکاریوں نے بھی شیر پر فائر کئے لیکن سب غالباً خالی گئے۔ شیر زمین پر گرے ہوئے شکاری کی طرف پنجہ اٹھا کر بڑھا ہی تھا کہ میں نے اسی غلیل میں لوہے کا نوک دار غلہ لگا کر شیر کی آنکھ پر مارا۔ غلہ شیر کے اس وقت لگا جب وہ اپنا پنجہ شکاری پر مارنا چاہتا تھا شیر کی آنکھ غلہ لگتے ہی پھوٹ گئی۔ اس نے ایک زور سے دھاڑ ماری اور پچھلے پاؤں چیختا ہوا جنگل میں بھاگ گیا۔ اسکی چیخوں کی آوازیں مسلسل دور ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ جب یہ چیخیں بالکل بند ہو گئیں اور صبح کے آثار رونما ہونے لگے تو دونوں شکاری مچانوں سے نیچے اترے اور زمین پر

گرے ہوئے شکاری کے پاس پہنچے غالباً اس کا کولہا اتر گیا تھا اٹھنے سے معذور تھا لیکن ہوش میں تھا۔

میں درختوں میں چھپا بیٹھا رہا۔ یکا یک ایک شکاری نے متواتر کئی ہوائی فائر کئے جن کی آوازوں پر گاؤں والے فوراً ہی آ موجود ہوئے۔ زخمی شکاری کے لئے گاؤں سے پلنگ لایا گیا اور اس کو لاد کر گاؤں لے جایا گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے شکاری جب جنگل سے چلے گئے تو میں درخت سے نیچے اترا۔ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں شکاری گرا تھا۔ تو مجھے وہاں ایک ٹارچ ایک تھرماس اور ایک تھیلا نظر پڑا۔ میں نے وہ تینوں چیزیں اٹھالیں اور ایک دوسرے راستے سے رحمو چچا کی دکان پر پہنچا۔ میں نے ان تینوں چیزوں کو واپس کرنا مناسب خیال نہیں کیا ورنہ گاؤں والے مجھے الزام دیتے کہ میں وہاں کیوں موجود تھا۔ ٹارچ کی مجھے [illegible] ضرورت تھی اور تھرماس کی بھی۔ تھیلا کھولنے پر مجھے اس میں ڈبل روٹی [illegible] ملے اور اس میں ایک کتاب انگریزی زبان میں چھپی ہوئی ملی [illegible] تھیں۔ میں نے اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا [illegible] کتاب میں غالباً شکاریوں کے حالات تھے۔ ایک تصویر میں [illegible] نے [illegible] اور آدمیوں کو بلم سے شیر کا شکار کرتے ہوئے دیکھا۔ میرے دماغ میں پہلی بار بلم کا خیال پیدا ہوا۔ میں نے رحمو چچا سے کہا۔

"مجھے ایک بلم بنا دو چچا۔ میں اب بلم سے شکار کی مشق کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولے "اچھی بات ہے۔"

انہوں نے اسی دن مجھے ایک ہلکا سا بلم بنا دیا جس کو لے کر میں چلا گیا۔ میں نے بلم کو نشانے پر پھینکنے کی مشق شروع کی۔ غلیل کی نشانہ بازی کی مشق اس میں بھی کام آ گئی۔ ایک ہفتے کے اندر ہی میں نے کئی تیتر مرغابیاں بلم سے چھید ڈالیں

-ایک ہرن بھی بلم سے زخمی کر کے گرا لیا۔ اب میں غلیل اور بلم [illegible] رکھنے لگا۔

ادھر میرے گاؤں والوں کو سکون ہو گیا۔ اس شیر نے [illegible] گاؤں کے لوگوں کا شکار شروع کر دیا جو یہاں سے نو میل دور تھا [illegible] جب شکاری وہاں پہنچے تو شیر نے ایک تیسرا گاؤں تاک لیا اور وہاں [illegible] اٹھائے جانے کی خبریں آنے لگیں۔ سرکاری کارندے اور شکاری بھی حیران تھے۔ جب وہ کسی گاؤں میں وقوعہ کرتا تھا اور شکاری پہنچتے تھے تو کیا جانے اسے کیوں کر خبر ہو جاتی تھی اور وہ اس گاؤں کو چھوڑ کر دوسری بستیوں پر حملے شروع کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ دو سال کی مدت گزر گئی۔ اس آدم خور نے تقریباً ساٹھ ستر آدمی ہلاک کر ڈالے۔ ہر گاؤں کے لوگ ہراساں اور پریشان نظر آنے لگے۔ کھیتی باڑی کے اوقات میں بھی دو ایک فالتو آدمی کھیتوں کی نگرانی پر ڈٹے رہتے تھے۔ وہ دن میں بھی تنہا آدمی نہیں چھوڑتا تھا۔ حکومت نے گھبرا کر ایک کروڑ روپے نقد کا اعلان کر دیا۔

بڑے بڑے جغادری شکاری آئے لیکن ناکام ہی رہ گئے۔ ایک دن میں رحمو چچا کی دکان پر بیٹھا ہوا بھٹی سلگا رہا تھا کہ میرے والد آئے اور آتے ہی مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا "بیٹا میرا سارا روپیہ ڈوب گیا ہے۔ میں پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا ہوں۔ جن جن لوگوں کو میں نے قرض کپڑا دیا تھا وہ سب لے کر بھاگ گئے۔ اب صرف کھیت ہی کھیت رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "آپ گھبرائیے نہیں۔ اللہ مالک ہے۔"

ان کے جانے کے بعد مجھے پہلی بار ایک کروڑ روپیہ انعام حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ آدم خور نردولی کے آدم خور کے نام سے مشہور تھا۔ یہ گاؤں

میرے گاؤں سے پچیس میل دور تھا۔ وہاں اس نے مسلسل گاؤں والے شکار کیے تھے [illegible] وہ اس کے قریب جنگلات میں موجود تھا۔ کئی شکاری نردولی میں مستقل مقیم تھے اور وہ ظالم آدم خور ان کی موجودگی میں ہر روز کسی نہ کسی آدمی کو شکار کر لیتا تھا [illegible] بھی باندھے گئے۔ مچانیں بھی بندھے۔ رات بھر شکاری اور گاؤں [illegible] شیر فکر میں ہے لیکن وہ نہ ہاتھ آتا تھا نہ ہاتھ آیا۔

[illegible] میں نردولی روانہ ہوا۔ میرے ساتھ اب ٹارچ بھی تھی [illegible] نے شہر سے منگوا کر بھروا لیے تھے۔ تھرماس بھی تھا جس میں [illegible] بھر لی تھی۔ وہ تھیلا بھی تھا جس میں مینڈا اڑانے والی پیپریاں [illegible] بھر لیے تھے۔ کچھ [illegible] روٹیاں بھی رکھ لی تھیں۔ غلیل اور بلم [illegible] جنگل روانہ ہوا۔ نردولی جنگل کی ایک ڈنڈیوں سے اس [illegible] سے پچیس میل۔ میں یہ آرام ڈھائی گھنٹوں [illegible] شکاریوں [illegible] کئی خیمے گاؤں کے باہر لگے ہوئے [illegible] ان کی خاطر [illegible] گاؤں [illegible] اپنی حیثیت سے زیادہ [illegible] اس گاؤں کے [illegible] میں نے دو پہر [illegible] لگے۔ مچان کے نیچے ایک بکرا باندھا گیا۔ کوئی پانچ چھ شکاری تھے اور سب کے سب مشہور [illegible]

ان مچانوں سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر میں نے ایک درخت کو اپنے بسیرے کے لیے منتخب کر لیا۔ میرے سامنے نہ کوئی پروگرام تھا اور نہ کوئی امید کامیابی۔ میں درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چاند آج کل رات کو بارہ بجے کے بعد نکلنے لگا تھا۔ رات جوں جوں بڑھتی گئی۔ جنگل کا سناٹا بھیانک سے بھیانک تر ہوتا

گیا۔ چوں کہ میں مچانوں سے کافی دور تھا۔لہٰذا شکار کا کوئی احوال مجھے معلوم نہ ہو سکا۔یکا یک چاند نکلا اور جنگل چاندنی میں نہا گیا۔ مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے۔ میں نے چائے پر چائے پی لیکن مجھے تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان بیری نما کڑوے پھلوں کو کھاتے ہی نیند آرام سے اڑ گئی۔اچانک میرے کانوں میں شیر کی آوازآئیں عجیب قسم دھاڑتھی۔

خوف اور غصے سے علیحدہ ایک قسم کی دھاڑتھی۔جس کے جواب میں ایک دوسری دھاڑ اسی قسم کی مجھے قریب سے سنائی دی۔ان دھاڑوں کا تبادلہ مسلسل شروع ہوا۔ مجھے بھاری قدموں کی چاپ اپنے درخت سے قریب ہوتی ہوئی سنائی دی۔ پتوں کے پیروں سے دبنے کے بعد جو کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی' صاف نمایاں تھی۔ یہاں تک کہ میں نے ایک شیر کو دیکھا جو ایک پیر سے لنگ کرتا تھا۔وہ میرے درخت سے دو گز کے فاصلے پر آ کر ٹھہرا۔ چاندنی میں مجھے صاف نظر آیا۔ اسکی ایک آنکھ زخمی تھی۔ میں سمجھ گیا یہ وہی آدم خور ہے جس کے لئے مچانوں پر شکاری بیٹھے ہوئے ہیں۔اب کی دور سے آنے والی دھاڑ نزدیک سے آنے لگی جس کے جواب میں اس شیر نے دھاڑ مارنے کے لئے منہ کھولا۔ بلا ارادہ میرا ہاتھ بلند ہوا اور میں نے بلم شیر کے کھلے ہوئے منہ میں مارا جو محض اتفاقاً اس کے حلق میں جا کر پھنس گیا۔شیر نے گھبرا کر جست لگائی اور جب وہ گرا تو اس کے گرنے سے بلم اور بھی اس کے سینے میں اتر گیا۔اس نے دھاڑیں مار کر تڑپنا شروع کیا۔ میں سمجھ گیا بلم اس کے سینے میں پھیپھڑوں یا دل کے پار اتر گیا ہے۔وہ تڑپتا رہا۔تڑپتا رہا۔اس کی چیخیں اب کراہوں میں تبدیل ہوگئیں۔ یہاں تک آواز آنا بالکل بند ہوگئی۔ میں صبح کا انتظار کرنے لگا۔تقریباً دو گھنٹے کے بعد صبح ہوگئی۔ میں نے اور انتظار کیا۔

جب دن روشن ہوگیا تو میں درخت سے نیچے اترا شیر کے قریب گیا۔وہ اب مر چکا تھا۔اب میں اس جانب بڑھا۔وہاں جس طرف شکاریوں کے مچان تھیں۔شکاری مچان سے اترے ہوئے کھڑے تھے اور سب کے سب حیران نظر آ رہے تھے۔ان کو گھیرے ہوئے گاؤں کے بیس پچیس آدمی کھڑے تھے۔

میں نے گاؤں والوں سے کہا''میں نے آدم خور کو بلم سے مار ڈالا ہے۔آپ لوگ چل کر اس کی لاش اٹھالیں۔''

ایک شکاری نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا''ارے لڑکے کیوں الو بنا رہا ہے۔کہیں بلم سے شیر مارا جاتا ہے؟''

میں نے کہا''سانچ کو آنچ نہیں ہے۔دو فرلانگ تک آپ کو چلنا ہوگا۔خود آپ لوگ دیکھ لیں گے۔''وہ لوگ بادل خواستہ ساتھ ہو لئے۔شیر کو مرا ہوا دیکھ وہ لوگ حیران رہ گئے۔ان میں اسی شکاری نے کہا''لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے اس کو بلم سے مارا ہے؟'' میں نے کہا'' گاؤں لے جا کر اس کی کھال دھڑواہیئے اس کے حلق کے اندر سے میرا بلم برآمد ہو جائے گا۔''

دیہاتیوں نے شیر کی لاش کو دو ڈنڈوں میں لگا کر گاؤں کا رخ کیا۔ جب شیر کی کھال اتاری گئی تو اس کے اندر میرا بلم برآمد ہوا۔ جو شیر کے پھیپھڑوں میں پھنسا ہوا تھا۔ سارے شکاری حیران رہ گئے۔ مکھیا نے اس کی اطلاع فوراً تانگہ پور کی کمشنری کو بھیجی جہاں سے دوسرے دن میری طلبی ہوئی۔میرے پہنچنے پر افسران کو بھی دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے بلم سے شکار کیا ہو میں نے بلم ہاتھ میں لے کر دور جاتی ہوئی ایک بکری پر بلم پھینک کر وار کیا۔بکری بلم سے چھد کر گر گئی۔ مجھے سرکار سے ایک کروڑ روپیہ انعام کا اور ایک بندوق کا لائسنس ملا اور [illegible] ایک شکاری کے سپرد کیا گیا کہ میں اس سے بندوق چلانا سیکھ لوں۔وہ ایک کروڑ ر

کر میں تے اپنے والد کے قدموں میں ڈال دیئے۔ انسان کا عزم محنت اور
انسان کو کامیابی کی منزل سے ضروری روشناس کرادیتی ہے۔

☆☆☆

خونی قبیلہ

شہباز بہت شریر اور نٹ کھٹ لڑکا تھا۔ دن رات نت نئی شرارتیں کر
اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ شرارتی ہوتا تو خیر ایسی کوئی بری بات نہیں ہے' لیکن ا
میں بدتمیزی بھی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اپنے گورے چٹے رنگ' موہنی صورر
دلکش آواز اور تندرست جسم پر اسے بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے ہم عمروں میں سے کسی کو
خاطر میں نہ لاتا تھا۔ دوسروں پر بے جا رعب جمانا اسے بہت بھاتا تھا۔ اس کو
[illegible] اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ اس کی شکائتیں اسکو
[illegible] کے ساتھ اس کی ٹھکائی بھی ہوتی' مگر
[illegible] برابر بھی اثر نہ ہوتا تھا۔

ان دنوں اس کی چھیڑ چھاڑ اور مار پیٹ کا نشانہ کامران بنا ہوا تھا
کامران اس کا ہم جماعت تھا۔ ایک دبلا پتلا اور نازک سا لڑکا۔۔۔۔ رنگ
کا کالا۔ شہباز اسے ہر وقت چھیڑتا رہتا اور ستایا کرتا۔ کبھی اسے کالا کلوٹا کہتا۔
کالا بھجنگ اور کبھی کبھار یہ تان چھیڑ دیتا:

''کالا کلوٹا۔ بینگن لوٹا۔ بڑے بازار میں دھم دھم کوٹا۔''

آخر تنگ آکر کامران بے چارہ ماسٹر صاحب سے شہباز کی شکایت کر
تو پھر اس کا نتیجہ بھی اسے ہی بھگتنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے وہ غریب ڈرا ڈرا اور
سہا رہتا تھا۔ اور خاموشی سے شہباز کے ظلم و ستم کو سہتا رہتا تھا۔

آج [illegible] شہباز کامران کو تنگ کرتا رہا۔ کبھی اسے لقشین کٹورا کہتا
کبھی [illegible] بچپن میں چیچک کے موذی مرض کے باعث کامران کی ایک
آنکھ جاتی رہی تھی' جس کی بنا پر اکثر اسے کانے کے خطاب سے بھی نوازا جاتا تھا۔
آج وہ بے چارا اسکول میں تمام وقت اور آتے جاتے راستے میں بھیگی بلی بنا رہا۔
اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' شہباز نے خوب اپنے دل کے ارمان
نکالے۔

رات کے وقت جب شہباز کھانا کھانے کے بعد پڑھنے کی کوشش کررہا تھا
تو کوشش کے باوجود اس کا ذہن کتابوں میں نہیں لگ رہا تھا۔ دن کے گزرے
ہوئے تمام واقعات اس کے ذہن میں اس طرح ابھر رہے تھے۔ جیسے سینما کے
پردے پر تصویریں ابھر آتی ہیں۔ اس کے دل میں بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ کل کس
کس طریقے سے وہ کامران کو ستائے' چھیڑے اور پریشان کرے تاکہ اسکے
دوسرے ساتھیوں پر بھی اس کا رعب بیٹھ جائے۔

شہر کے مغرب کی جانب ایک بہت گھنا اور خوفناک جنگل تھا۔ وہاں ایک
دن شہباز اپنی ائیر گن لئے ننھی منی چڑیوں کا شکار کرتا پھر رہا تھا۔ نہ جانے کس
طرح آج کامران بھی اس کے ساتھ ہولیا تھا۔ کامران دل کا بڑا نازک تھا۔ رحم کا
جذبہ اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ننھی منی چڑیوں سے بے حد
محبت کرتا تھا۔ شہباز راستے میں اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اس نے کامران
کو اپنے ہمراہ اس لئے لے لیا تھا کہ وہ اس کے شکار کا تھیلا وغیرہ پکڑے رہے اور
شکار میں اس کی مدد کرے۔ شکار کرتے کرتے وہ دونوں جنگل میں کافی دور جا نکلے
اور راستہ بھول گئے۔

کامران اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ اس نے شہباز سے کہا رات سر پر

آ رہی ہے اور ہمیں راستہ بھی نہیں مل رہا ہے۔ اب ہم گھر کیسے پہنچیں گے؟ جیسے جیسے رات قریب تر ہو رہی تھی اس کی گھبراہٹ برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

شہباز خود بھی اس حالت سے گھبرا رہا تھا' مگر اسے کامران کو تنگ کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ بولا کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں آج کسی بھوت یا چڑیل کے حوالے کر کے خود بھاگ کر گھر پہنچ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ قہقہے لگانے لگا۔ مگر جب رات ہو گئی اور اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ بھی گھبرا گیا۔

جنگل میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چاروں طرف ایک مہیب سناٹے کا عالم طاری تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بھوک کے مارے بھی دونوں کا برا حال تھا۔ رہ رہ کر گیدڑوں کے بھونکنے کی آوازیں آتیں۔ کبھی کبھی الو کے بولنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔ وہ بہت پریشان ہوئے کہ اس عالم میں جنگل میں رات گزارنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ سہمے ہوئے چل رہے تھے کہ نہ جانے کس طرف سے کوئی جنگلی جانور آ نکلے اور انہیں پھاڑ کر چٹ کر جائے۔

جنگل میں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اور اس خاموشی میں اگر کوئی پتا ہلتا یا کسی جنگلی جانور کے بولنے کی آواز دور سے بھی آتی تو دونوں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتے۔ تین چار گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر انہیں ایک طرف کچھ روشنی نظر آئی۔ اس روشنی میں ہلتے ہوئے کچھ سائے سے دکھائی دے رہے تھے۔ اب دونوں کی ہمت بندھی اور وہ اس جانب بڑھنے لگے۔ جب وہ اس روشنی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہاں بہت سے جنگلی انسان جمع تھے۔ میدان کے بیچ میں ایک بڑا سا بت رکھا تھا' جو ان کے دیوتا کا تھا۔ بت کے سامنے آگ کا ایک بڑا سا الاؤ جل رہا تھا۔ آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور یہ جنگلی لوگ بت کے سامنے جھکے ہوئے رو رہے تھے اور گڑگڑا رہے تھے۔

کامران اور شہباز بڑی حیرت سے بت بنے قریب ہی چھپ کر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک جنگلی کی نظر ان پر جا پڑی۔ وہ خوشی کے مارے بے ساختہ چیخ اٹھا: ''سردار' سردار! اب طوفان نہیں آئے گا۔ مصیبتوں کی بلا' ہمارے سروں پر سے ٹل جائے گی۔ دیوتا اپنا غضب اور غصہ ختم کر کے' ہم سب کو اپنی رحمت سے مالا مال کر دے گا۔''

وہ جنگلی کچھ اس انداز سے چیخ جا رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔

''کیسے؟ کس طرح؟'' سردار نے پوچھا چونکہ وہ سب سے آگے تھا۔ اس لئے اس کی نظر شہباز اور کامران پر نہیں پڑی تھی۔

وہ جنگلی جس نے انہیں دیکھ لیا تھا' بولا: ''سردار' دیوتا نے ہم پر مہربانی کی ہے۔ اس نے دو انسانوں کو قربانی کے لئے خود ہمارے پاس بھیج دیا ہے۔''

یہ سن کر تمام جنگلی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی طرف دوڑے۔ انہوں نے دونوں لڑکوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اس ان کے گرد خوشی سے ناچنے لگے۔

اس طرح مصیبت میں خود کو گھرا پا کر کامران اور شہباز کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ موت انہیں اپنے سامنے کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

جنگلیوں کے تھرکتے ہوئے پاؤں آہستہ آہستہ رکنے لگے اور رقص ختم ہو گیا۔ دو جنگلی ان کی طرف آگے بڑھے اور کامران اور شہباز کو ہاتھوں سے پکڑ کر بت کے سامنے جلتی ہوئی آگ کے شعلوں کے پاس کھڑا کر دیا۔

سردار بولا: ''بھائیو! ہر سال ہم اپنے دیوتا کو کسی انسان کی قربانی پیش کیا کرتے ہیں۔ اور پھر سارا سال دیوتا کی مہربانیاں ہم پر رہتی ہیں۔ اس سال اس مقدس قربانی کے لئے کوئی انسان نہ مل سکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے دیوتا نے غصے میں آ کر آندھی اور طوفان کی مصیبت ہم پر بھیجی تھی۔

مگر اب ہمارے دیوتا کو ہم پر رحم آ گیا ہے۔ اس نے خود ہی دو انسانوں ہمارے پاس بھیج دیا ہے۔ آؤ اب ہم ان دونوں میں سے کسی ایک کو قربانی کے لئے چن لیں کیونکہ ہمیں قربانی صرف ایک انسان کی کرنی ہے۔"

کامران اور شہباز خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے اور ساتھ ساتھ وہ بری طرح رو رہے تھے۔ گڑگڑا رہے تھے۔ گڑگڑا رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے۔ مگر جنگلیوں نے ان کی ایک نہ سنی۔

جنگلیوں کے سردار نے شہباز کو قربانی کے لئے پسند کرتے ہوئے کہا:

"میرے ساتھیو! یہ لڑکا قربانی کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ یہ دوسرا لڑکا کمزور، بیمار اور بدصورت ہے۔ اس کی نذر سے ہمارا دیوتا خوش نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس دوسرے لڑکے کو ہمیں چھوڑ دینا چاہیے۔"

سردار نے کامران کو چھوڑ دیا۔ اور شہباز کو جلتی ہوئی آگ کے پاس لا کھڑا کیا۔

شہباز کی حالت دیکھ کر کامران بری طرح رو رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔ مجھے اس کی جگہ قربان کر دو۔ خدا کے لئے اسے قربان نہ کرو۔"

شہباز بڑی حیرت سے کامران کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ کامران میرے لئے کس قدر بے چین ہے اور میں تھا کہ اسے ہر وقت پریشان کرتا تھا۔ وہ تو میری جگہ خود مرنے تک کے لئے تیار ہے۔

قربانی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ کامران برابر یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح شہباز کی جگہ پہنچ جائے اور خود مر کر اسے بچا لے۔ جنگلی جلاد جس کے

ہاتھ میں ننگی تلوار تھی قریب کھڑا دیکھ کر کامران کے حواس گم ہو گئے اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی جلاد کو اور کبھی ان وحشیوں کے مجمع کو دیکھتا تھا۔ مگر رحم کے آثار کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے۔ جلاد ننگی تلوار لے کر آگے بڑھا۔ قربانی کے منتر شروع ہو چکے تھے۔ کامران کی آہ و بکا اور شہباز کی چیخیں فضا کو نہایت ڈراؤنا اور ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔ منتر پڑھنے کی آواز تیز ہو گئی اور جلاد کی تلوار اوپر کو اٹھی۔

"نہیں نہیں۔ بچاؤ بچاؤ۔ میں مرا۔ امی امی! ابا ابا!" شہباز زور سے چیخ رہا تھا۔

"کیا ہے؟ کیا ہے شہباز؟ اٹھو! کیا خواب دیکھ رہے ہو؟" اس کی امی اسے آوازیں دے کر اٹھا رہی تھیں۔

شہباز آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ وہ کافی سہما ہوا تھا۔ اب اس کے سامنے نہ وہ جنگل تھا اور نہ وہ انسان نما جنگلی اور وحشی درندے۔ وہ تو اپنے گھر میں اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔

اس کی امی نے پوچھا "بیٹا کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے؟ اٹھو اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔"

اس دن شہباز اسکول گیا تو وہ پہلے جیسا شہباز نہ تھا۔ اب وہ ایک شریف اور تمیز دار لڑکا بن گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے اسے کامران یا کسی اور لڑکے کو چھیڑتے، تنگ کرتے یا ستاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

☆☆☆

جاسوس چوہا

پیارے بچو!

ناصر کو اپنے گھر میں خوبصورت مچھلیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔

اُسے اپنے جیب خرچ کے لیے جو پیسے ملتے تھے، اس میں سے ناصر نے تھوڑے سے پیسے جمع کر کے شیشے کا مرتبان خریدا اور اسے گھر لے آیا۔ اس کی امی نے کہا۔

ماجد بیٹا!

یہ مرتبان کس لئے لائے ہو؟

ماجد نے کہا۔

امی جان!

''میں اس مرتبان میں پانی ڈالوں گا اور پھر بازار سے ایک جوڑا سنہری مچھلیوں کا خرید کر لاؤں گا اور انہیں مرتبان میں ڈال کر اُن سے کھیلا کروں گا۔''

ماجد نے امی سے پیسے لئے اور اپنے نوکر کے ساتھ مارکیٹ میں چلا گیا۔

وہاں سے ایک سُرخ رنگ کی مچھلی مِل گئی۔ ماجد اس مچھلی کو خرید کو گھر لے آیا۔ سُرخ مچھلی اس نے مرتبان میں ڈال دی۔ اس کے ساتھ ہی ماجد نے مرتبان کے پانی میں تھوڑی سی ریت اور کچھ نیلے پیلے پتھر ڈال دیئے تا کہ مچھلی کو ایسا لگے جیسے وہ دریا میں تیر رہی ہے۔

ماجد مچھلی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ وہ روز صبح شام سُرخ مچھلی کو ڈبل روٹی کے بھورے ڈالتا، سُرخ مچھلی کبھی ایک آدھ بھورا کھا لیتی اور پھر چُپ چاپ ماجد کو اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھا کرتی۔

ماجد بڑا خوش تھا کہ اُسے لال مچھلی مل گئی ہے۔ جب وہ مرتبان کے پانی میں اِدھر اُدھر تیرتی اور اپنے ننھے ننھے پَر ہلاتی تو ماجد بڑا خوش ہوتا۔

پیارے بچو!

آدھی رات کو جب گھر کے سارے لوگ سو جاتے تو مرتبان کی لال مچھلی اپنے گھر والوں، بہن بھائی اور ماں باپ کو یاد کر کے چپکے چپکے رویا کرتی۔ لیکن اس کے رونے کی آواز کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ نہ ماجد سُن سکتا تھا نہ اُس کی امی جان سُن سکتی تھیں۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ مچھلی مرتبان میں بڑی خوش ہے مگر ایسا نہیں تھا۔

مچھلی بڑی اُداس تھی اور پھر اُداس کیوں نہ ہوتی۔ ایک ماہی گیر اسے جال میں پکڑ کر دریا سے لے آیا تھا اور اُس نے دوسری مچھلیوں کے ساتھ اُسے بھی دُکاندار کے پاس بیچ دیا تھا۔ لال مچھلی بے چاری گھر سے سکول پڑھنے نکلی تھی کہ اچانک اُوپر سے دریا میں ماہی گیر نے جال پھینکا اور وہ اس میں پھنس گئی۔ اس کی کتابیں اور کاپیاں وہیں گر پڑیں۔ وہ بہت روئی بہت چیخی بہت چلائی مگر کسی نے اُس کی فریاد نہ سنی۔ کوئی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔

اس کے ماں باپ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کی پیاری بیٹی، لال مچھلی اسکول پڑھنے گئی ہے۔ جب وہ گھر واپس نہ آئی تو اس کی امی بھاگی بھاگی سکول گئی۔ اس نے استانی سے پوچھا تو اس نے کہا۔

''بہن! ساری مچھلیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی ہیں، سکول تو بند ہونے والا ہے۔''

امی نے کہا۔

''لیکن میری مچھلی ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔''

''استانی نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''بہن! اگر وہ ابھی تک گھر نہیں آئی تو ضرور کسی ماہی گیر کے جال میں پھنس گئی۔ میں نے آج ہی کلاس روم میں لیکچر دے کر ساری مچھلیوں کو بتایا تھا کہ ویسے ماہی گیر جال پھینکے تو اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی لال مچھلی نے اچھی طرح میری بات نہیں سُنی اور جال میں پھنس گئی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

لال مچھلی کی امی روتی ہوئی گھر واپس آ گئی، گھر واپس آ کر اس نے ساری بات لال مچھلی کے بھائی جھینگے کو بتا دی۔ جھینگا بھی غمگین ہو گیا اور اپنی پیاری بہن لال مچھلی کو یاد کرنے لگا۔ اس کی امی نے کہا۔

''بیٹے! خالی یاد کر کے آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ تمہاری بہن واپس گھر آ جائے۔''

جھینگے نے کہا۔

امی جان!

دریا کنارے میرا ایک چوہا دوست رہتا ہے۔ میں ابھی جا کر اسے کہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ چلے اور ہم دونوں بہت جلد اپنی بہن کو تلاش کر کے لے آئیں گے۔

جھینگا اسی وقت دریا کے اوپر کنارے پر آ گیا۔ چوہے کا گھر جھاڑیوں میں تھا۔ جھینگے نے جا کر دروازے پر گھنٹی بجائی۔ اس وقت چوہا اپنے پلنگ پر بیٹھا دال میں کنگھی پھیر رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا کہیں باہر بلی تو نہیں ہے۔ کیونکہ ایک بار اسی طرح بلی بھی گھنٹی بجا کر چلی گئی تھی۔ چوہے نے دیکھا، باہر اس کا دوست جھینگا کھڑا ہے۔ چوہے نے دروازہ

کھول کر کہا ''آؤ جھینگا بھائی! صبح صبح کیسے آ نکلے؟ خیر تو ہے؟'' جھینگے نے کہا۔

''بھائی! میری بہن لال مچھلی کو ماہی گیر پکڑ کر لے گیا ہے۔ گھر والے سارے پریشان ہیں کہ خدا جانے بے چاری کس حال میں ہے۔ میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو۔

''لیکن ہم چل کر لال مچھلی کو کیسے پہچانیں گے؟'' چوہا بولا۔

''کیا تمہارے پاس لال مچھلی کو کوئی تصویر نہیں ہے؟ تم مجھے اس کی تصویر دے دو۔ میں کسی نہ کسی طرح اُسے تلاش کر کے گھر واپس لے آؤں گا۔''

جھینگے نے کہا۔ ہاں! ''گھر پر اس کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے جو اس نے اپنے سکول کے کارڈ میں لگائی ہوئی ہے۔ میں ابھی تمہیں وہ تصویر لا کر دیتا ہوں۔'' ''بس ٹھیک ہے تم تصویر لا دو۔ باقی میں لال مچھلی کو لے کر ہی آؤں گا، فکر نہ کرو۔ امی کو بھی میری طرف سے تسلی دینا اور کہنا کہ چوہا کبھی ناکام واپس نہیں آیا۔''

جھینگا اسی وقت اپنے گھر واپس آیا۔ اس نے امی کو تسلی دی اور لال مچھلی کے کارڈ پر سے تصویر نکال کر لے گیا۔ تصویر اس نے چوہے کے حوالے کر دی۔ چوہے نے تصویر اپنی پتلون کی جیب میں رکھی اور کہا۔

''بس اب تم آرام سے گھر جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں جانوں اور میرا کام جانے۔''

''جھینگے کے جانے کے بعد چوہے نے جیکٹ پہنی جیکٹ کے اندر بارہ گولیوں والا پستول لگایا، ٹارچ جیب میں رکھی۔ آنکھوں پر عینک لگائی اور ٹھر پر تالا لگا کر لال مچھلی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ چوہا اس لباس میں بالکل کسی انگریزی جاسوسی فلم کا ہیرو لگ رہا تھا۔''

گھر سے نکل کر وہ سڑک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اُس بس کا انتظار تھا جو کہ جس میں ماہی گیر دریا پر سے جو مچھلیاں پکڑ کر لے جاتے ہیں، اور انہیں وہ بڑی مارکیٹ میں لے جا کر بیچ دیتے ہیں۔ سڑک پر ایک بس آ کر کھڑی ہو گئی۔ چوہے نے دُور سے ہی پڑھ لیا تھا کہ بس مچھلی منڈی کو جا رہی ہے۔ بس کے کنڈکٹر نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔

''چلو مچھلی منڈی! مچھلی منڈی!

چوہا لپک کر بس کے پیچھے آ گیا اور پھر لوہے کی سیڑھی چڑھ کر بس کی چھت پر سواریوں کے ٹرنکوں کے درمیان جا کر بیٹھ گیا۔ بس چل پڑی۔ چوہے نے منہ میں چیونگ گم ڈالی اور مزے سے چباتے ہوئے گنگنانے لگا۔ بس اب شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ چوہے نے دیکھا۔ دونوں طرف سے اونچی اونچی بلڈنگیں پیچھے جا رہی تھیں۔ چوہا اس سے پہلے بھی شہر کی سیر کر چکا تھا۔

مچھلی منڈی کے بس اسٹاپ پر آ کر بس رک گئی۔

چوہا چپکے سے ٹرنکوں سے نکلا اور کود کر نیچے سڑک پر آ گیا۔ کودنے سے اُس کا ہیٹ سڑک پر گر گیا۔ چوہے نے چیونگ گم چباتے ہوئے ہیٹ سڑک پر سے اٹھا کر جھاڑا اور سر پر رکھ لیا۔ اب وہ دیوار کے ساتھ ساتھ ہوتا مچھلی منڈی میں آ گیا۔ یہاں بہت شور مچا تھا۔ چوہے کو معلوم تھا کہ لال مچھلی کون سی دکان پر بکتی ہیں۔ وہ ایک دکان کی چھت پر سے ہو کر اس کے دروازے پر آ گیا۔

چوہا دکان کے اندر داخل ہو رہا تھا کہ ایک کتا اس کے سامنے آ کر زور سے بھونکا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ چوہے نے ایک سیکنڈ کے اندر اندر جیکٹ میں سے پستول نکال کر کتے سے کہا۔ ''ہینڈز اَپ''

کتنے نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ چوہے نے کہا۔

''اگر تم نے مجھ پر حملہ کیا تو میں گولی چلا دوں گا۔ چپ چاپ جس طرف سے آئے ہو اسی طرف کو واپس چلے جاؤ۔ خبردار پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔''

کتا تو چوہے کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر کانپنے لگا تھا۔ بولا۔ چوہا بہادر!

''میں معافی مانگتا ہوں پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔'' اور کتا چپکے سے دم دبا کر وہاں سے بھاگ گیا۔ چوہے نے پستول جیکٹ میں رکھا اور دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر جا کر اس نے مرتبانوں میں رکھی ہوئی مچھلیوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ لال مچھلی کی تصویر اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ہر مچھلی کی شکل لال مچھلی کی تصویر سے ملاتا مگر کوئی بھی مچھلی اس شکل کی وہاں نہیں تھی۔

چوہا دکان سے باہر نکل رہا تھا کہ اسے سامنے ایک ماہی گیر یعنی مچھلیاں پکڑنے والا نظر آ گیا۔ چوہا چھلانگ لگا کر مچھلیاں پکڑنے والے کے آگے آ گیا اور پستول تان کر بولا۔ ظالم ماہی گیر!

''تم نے میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' ماہی گیر نے چوہے کے ہاتھ میں پستول دیکھا تو ڈر گیا اور بولا۔ چوہا صاحب! '' آپ کو جو پوچھنا ہے پوچھیں میں ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔''

چوہے نے کہا۔

''کیا تو نے لال مچھلی دیکھی ہے جس کی آنکھیں نیلی ہیں اور پر سنہری ہیں یہ اُس کی تصویر'' ماہی گیر نے تصویر دیکھ کر مچھلی پہچان لی اور بولا۔

ہاں جناب! میں نے ہی اس مچھلی کو دریا سے پکڑا تھا مگر میں نے اس مچھلی کو دکان نمبر 6 پر بیچ دیا تھا۔''

ماہی گیر تو اپنا جال کندھے پر ڈال کر وہاں سے بھاگ گیا چوہا اب مچھلی منڈی کی دکان نمبر 6 میں آ گیا۔ یہ دکان چھوٹی سی تھی۔ یہاں ایک موٹا تازہ بلا

اندر گھوم رہا تھا۔ بلے نے چوہے کو دیکھا تو پھوں پھاں کرتا، غصے میں اس کی طرف لپکا چوہا اچھل کر سامنے آ گیا اور اس نے ایک بار پھر پستول نکال لیا۔

''خبردار موٹے بلے!''

''اپنی جگہ سے مت ہلنا نہیں تو گولی مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔''

بلا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ چوہے نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مار کر کہا۔ ''دوڑ جا یہاں سے اور خبردار پیچھے مڑ کر مت دیکھنا سمجھے؟'' موٹے بلے نے ڈرتے ہوئے کہا۔ جو حکم چوہا صاحب!

اور موٹا بلا وہاں سے دم دبا کر رفو چکر ہو گیا۔

چوہا اب شیشے کے چوکور بکس کے پاس آیا جس میں پانی تھا اور مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ چوہے نے ایک مچھلی سے کہا۔

''بہن اس تصویر والی لال مچھلی کو پہچانتی ہو؟'' بکس والی مچھلی نے کہا۔

''ارے ہاں! یہ تو بک بھی گئی ہے۔ اسے میرا خیال ہے کہ ماجد لے گیا ہے جو ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہے۔'' چوہے نے مچھلی کا شکریہ ادا کیا اور منڈی سے باہر آ گیا۔ باہر ایک رکشا ابھی آ کر رُکا تھا اور ایک عورت اُسے ماڈل ٹاؤن جانے کو کہہ رہی تھی۔ چوہا رکشے کی چھت پر بیٹھ گیا۔ راستے میں ہوا کے زور سے چوہے کا ہیٹ اُڑتے اُڑتے بچ گیا۔ چوہے نے ہیٹ اپنی بغل میں دبا لیا۔ رکشا ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی کے آگے رک گیا۔ چوہا چھلانگ لگا کر اُتر پڑا۔

''سامنے ایک کھوکے والے کی دکان پر ایک چوہا کوکا کولا پی رہا تھا۔ ہمارا چوہا اُس کے پاس گیا اور اُس سے ماجد نام کے لڑکے کے گھر کا پتا پوچھا۔ چوہے نے پتا بتا دیا۔ ہمارا چوہا اس مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ماجد کا مکان نیم کے درختوں کے سائے میں تھا۔ چوہا اُس مکان کے گیٹ پر آ گیا۔ باہر ماجد کے نام کی

ی لگی تھی۔ چوہا خوش ہوا کہ آدھا کام ہو گیا۔''

جوں ہی وہ اندر داخل ہوا، ایک سفید رنگ کے بالوں والا کتا بھونکتا ہوا اس کی طرف بھاگا، چوہا لپک کر دوسری طرف ہو گیا۔ کتا بھی اسی طرف آ گیا۔ چوہا درخت پر چڑھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پستول چلا کر گھر والوں کو ہوشیار نہیں کرنا چاہیے۔ درخت پر چڑھتے ہوئے چوہے کا پیر پھسل گیا اور نیچے گر پڑا۔ کتا اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اب چوہے کو جان کا خطرہ تھا اس نے جھٹ جیکٹ میں سے پستول نکال کر ایک ہوائی فائر کر دیا۔

گولی کی آواز سن کر کتا ڈر کر بھاگ گیا۔ چوہا جلدی سے درخت پر چڑھ گیا۔ درخت پر چڑھ کر وہ ایک ٹہنی پر بیٹھ گیا۔ پھونک مار کر اس نے پستول کی نال صاف کی اور اوپر والی شاخ سے چھلانگ لگا کر وہ مکان کی چھت پر آ گیا۔ یہاں ایک روشندان تھا، چوہا روشندان میں سے اندر کمرے میں کود گیا۔ یہاں صرف چارپائیاں اور پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ چوہا یہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں گیا۔ یہاں میز پر ماجد کی کتابیں رکھی تھیں۔

اچانک چوہے کو لال مچھلی کے سسکیاں بھرنے اور رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگ کر اگلے کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک میز پر پانی سے بھرا ہوا مرتبان پڑا تھا جس میں لال مچھلی سسکیاں بھرتی ہوئی رو رہی تھی۔ چوہے نے جیب سے تصویر نکال کر دیکھی۔ ہو بہو وہی شکل تھی۔ یہی جھینگے کی بہن لال مچھلی تھی۔

چوہے نے جا کر ہیٹ اُتار کر سلام کیا اور کہا۔

''بہن تیار ہو جاؤ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ مجھے تمہارے بھائی اور ابا جان نے بھیجا ہے۔'' لال مچھلی تو بہت خوش ہو گئی۔ چوہے نے کیا کیا کہ اُچھل کر میز پر اور وہاں سے اُچھل کر مرتبان کے اوپر آ گیا۔ پھر اس نے اپنی دم مرتبان سے

ندر ڈال کر کہا۔ ''لال مچھلی میری دُم کو پکڑلو۔''
مچھلی نے چوہے کی دم پکڑ لی، چوہے نے مچھلی کو باہر کھینچ لیا۔ پھر اس نے
ل مچھلی کو اپنے کندھے پر بٹھایا اور پھلانگ کر روشندان سے باہر چھت پر آ گیا۔
یہاں ایک رکشا کھڑا تھا۔ چوہے نے رکشے والے سے بات کرنی چاہی تھی کہ
سامنے سے دریا پر جانے والی بس آ گئی۔ چوہا مچھلی کو لے کر بس کی چھت پر چڑھ گیا
۔ بس چل پڑی، دریا پر بس رکی تو چوہا مچھلی سمیت نیچے آ گیا۔ پھر اس نے مچھلی کو
ریا میں ڈال کر کہا۔
''بہن! اپنے گھر جاؤ اور آگے سے جال سے خبردار رہنا۔''
مچھلی خوشی خوشی اپنے گھر آ گئی۔ اس کی ماں اور بہن بھائی اس سے مل کر
ہت خوش ہوئے۔ انہوں نے چوہے کی بہت بڑی دعوت کی جس میں اُسے میٹھا
لیک کھلایا۔

☆☆☆